ملک صفدر حیات (سیریز نمبر 20)
مشیت ایزدی
(تحریر حسام بٹ)
سسپنس ڈائجسٹ : دسمبر 2020

مشیتِ ایزدی

ملک صفدر حیات

محبت کی پگڈنڈیوں پر چلنے والے پیر جب سنگ ریزوں پر پڑتے ہیں تو یقیناً کچھ انہونی جنم لیتی ہے۔ وہ بھی بہت معصوم بہت کھرا انسان تھا مگر حالات نے اسے ایک ایسی دلدل میں دھکیل دیا تھا جس میں سے نکلنے کی تگ و دو اسے مزید زمین میں دھنساتی جارہی تھی حتیٰ کہ اس کے اندر جینے اور سنبھلنے کی خواہش نے ہی دم توڑ دیا کیونکہ رائی سے پہاڑ بن جانے والی بات نے ظالم کو کچھ یوں شہ دی کہ مظلوم بالآخر سراپا انتقام بن گیا اور پھر ملک صفدر جیسے قانون کے رکھوالے بھی اس مجرم کی بے بسی پر حیران رہ گئے۔

ظلم کی چکی میں پسنے والے ایک بے گناہ

انسان کی دلگیر تباہی کا منظر

موضع ظفر گڑھ میں ہونے والی انہونی نے ہر پیر و جواں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ظفر گڑھ کے آس پاس کے دیہات کوٹ ضامن، کنگن پور اور ایوب نگر میں بھی جس نے اس ناقابل یقین واقعے کے بارے میں سنا، دانتوں میں انگلیاں دبالیں۔ روز روشن کی طرح واضح حقیقت یہ تھی کہ گزشتہ رات کوئی نامعلوم شخص چودھری فیروز کی ایک ٹانگ کاٹ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا......!

وہ ماہ جنوری کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ شب خون مارنے والے نے بڑے تہور کا مظاہرہ کیا تھا۔ چودھری فیروز، ظفر گڑھ کی آن، بان اور شان تھا۔ اس کا رعب و دبدبہ دور دور تک مشہور تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ چودھری کے سامنے اونچی آواز میں بات بھی کرے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی ایسی جرأت بھی دکھا سکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہونے والی بات ہو چکی تھی۔ کسی کے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔

ظفر گڑھ میرے تھانے سے محض دو میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع تھا۔ اس تھانے میں میری تعیناتی کو ابھی صرف تین ماہ ہی ہوئے تھے۔ ایک ٹھنڈی ٹھار صبح میں تیار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو یہی خبر میری منتظر تھی۔ میں نے اطلاع کنندگان کو فوراً اپنے پاس بلالیا۔

وہ دو افراد تھے جن میں ایک چودھری فیروز کا بڑا بیٹا چودھری اکرام اور دوسرا اس کا ایک نوکر شوکت تھا۔ چودھری اکرام نے مجھے اس سانحے کے بارے میں بتایا۔ میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

''چودھری صاحب اس وقت کہاں ہیں؟''

''انہیں ہم رات ہی کو سمندری کے جنرل اسپتال لے گئے تھے۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''ابا جی کی ٹانگ میں سے خون کسی فوارے کی طرح خارج ہو رہا تھا۔ ہمیں اور کچھ نہیں سوجھا تو فی الفور انہیں تانگے میں ڈال کر اسپتال لے گئے۔ چھوٹا بھائی چودھری انعام اباجی کے پاس ہی ہے۔ میں بھی رات بھر ادھر ہی تھا۔ اباجی نے اصرار کیا کہ اس واقعے کی رپورٹ درج کرانا ضروری ہے۔ انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

''چودھری صاحب ایک دانا و بینا انسان ہیں۔'' میں

نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ ایک اتفاق ہے کہ ابھی تک میری ان سے ملاقات نہیں ہوسکی لیکن میں نے ان کی دانش مندی اور بردباری کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ خیر......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

''حملہ آور کے بارے میں کچھ پتا چلا؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اباجی نے بس اتنا ہی بتایا ہے کہ حملہ آور تین افراد تھے اور انہوں نے پیشہ ور ڈاکوؤں کی طرح ڈھاٹے لگا رکھے تھے۔ اباجی کی حالت کو دیکھتے ہوئے ہم نے زیادہ کریدا نہیں۔''

''یہ تم لوگوں نے بہت اچھا کیا۔'' میں نے تعریفی نظر سے چودھری اکرام کی طرف دیکھا۔ ''جو بھی پوچھنا ہے، اب میں ہی ان سے پوچھوں گا۔''

چودھری اکرام کی عمر بیس سال کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر حزن و ملال کی پرچھائیاں نظر آرہی تھیں مگر مزاجاً وہ ٹھنڈی طبیعت کا مالک تھا۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ پایا جاتا تھا۔

''تو میں سمجھ لوں کہ آپ نے اس واقعے کی رپورٹ درج کرلی ہے؟'' اس نے بوجھل لہجے میں استفسار کیا۔

''ہاں...... ابتدائی رپورٹ درج ہوگئی ہے جسے کچی ایف آئی آر بھی کہتے ہیں۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''پکی رپورٹ میں چودھری صاحب کا بیان لینے کے بعد تیار کروں گا۔''

''آپ اباجی کا بیان لینے کب اسپتال جائیں گے؟'' اس نے پوچھا۔ ''ادھر اسپتال والوں نے ہمارے اثر رسوخ کی بنا پر اباجی کا علاج تو شروع کردیا ہے لیکن وہ پولیس کی رپورٹ مانگ رہے تھے......!''

''میں ابھی سمندری کے جنرل اسپتال روانہ ہورہا ہوں۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اسپتال والوں کا مطالبہ اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ اس نوعیت کے معاملات میں پولیس کی رپورٹ کے بغیر انہیں کسی کا بھی علاج کرنے کی قانوناً اجازت نہیں ہوتی۔''

''تو پھر آپ مجھے اجازت دیں۔'' وہ تشکرانہ انداز میں بولا۔ ''میں حویلی جارہا ہوں تاکہ امی جی کو سنبھال سکوں۔ اس واقعے نے امی جی کی حالت خراب کردی ہے۔''

''اکرام! تمہیں یاد سے ایک کام کرنا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی، آپ حکم کریں......'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''جس کمرے میں یہ افسوس ناک واقعہ پیش آیا ہے وہاں کی کسی شے کو اِدھر اُدھر نہیں کرنا بلکہ مذکورہ کمرے کا دروازہ اور تمام کھڑکیاں بند کروادیں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں اسپتال سے سیدھا حویلی آؤں گا۔ وقوعہ کا تفصیلی نقشہ تیار کرنا بھی ضروری ہے۔''

''ہم نے صرف اباجی کو پلنگ سے اٹھایا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''باقی سب کچھ جوں کا توں ہے۔''

''میرے آنے تک وہ سب کچھ جوں کا توں ہی رہنا چاہیے۔'' میں نے چودھری اکرام کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟''

''سمجھ گیا تھانے دار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی ہدایات کا خاص خیال رکھوں گا۔''

چودھری اکرام کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل امجد علی کو اپنے ساتھ لیا اور اسپتال کی جانب روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

میرا تھانہ تحصیل سمندری، ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کا ایک دور دراز علاقہ تھا۔ ظفر گڑھ کے علاوہ ایوب نگر، کنگن پور، کوٹ ضامن، نصیر آباد اور کرماں والا نامی گاؤں بھی میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے تاہم فی الحال مجھے ظفر گڑھ کا مسئلہ درپیش تھا جہاں کے باجبروت چودھری فیروز کی ایک ٹانگ کاٹ کر کوئی اپنے ساتھ لے گیا تھا اور چودھری زخمی حالت میں سمندری کے جنرل اسپتال میں پڑا ہوا تھا۔

جب میں چودھری فیروز کے پاس پہنچا تو وہ اسپتال کے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اسے فوری طبی امداد دے دی گئی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی بائیں ٹانگ گھٹنے کے نیچے سے غائب تھی۔ اسپتال والوں نے نہایت ہی ذمے داری کا ثبوت دیتے ہوئے باقی ماندہ ٹانگ پر اطمینان بخش پٹی کردی تھی۔ چودھری کے بیڈ کے نزدیک ہی اس کا چھوٹا بیٹا انعام ایک چوبی بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی انعام اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔

میں چودھری فیروز کے قریب بینچ پر بیٹھ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس کا حال چال دریافت کیا تو وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ جو آپ مجھے

دیکھنے آئے۔ میں نے پچھلے دنوں کئی بار ارادہ کیا کہ آپ سے ملاقات کرنے تھانے جاؤں مگر ہر بار کسی ضروری کام نے میرے پاؤں میں بیڑی ڈال دی۔ شاید قدرت کو ہماری ملاقات اسی حال میں منظور تھی......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے حسرت بھرے انداز میں اپنی ادھوری ٹانگ کو دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جان بچ گئی......!''

''حملہ آور جو کوئی بھی تھا وہ آپ کی جان کا دشمن نہیں تھا چودھری صاحب، ورنہ ٹانگ کاٹنے پر اکتفا نہ کرتا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جانی دشمن بھلا جان لیے بغیر کہاں ٹلتے ہیں؟ باقی جہاں تک ہماری ملاقات کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں، میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔ میں نے بھی کئی بار آپ کی حویلی یاترا کے بارے میں سوچا لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں نے تین ماہ پہلے ہی اس تھانے کا چارج سنبھالا ہے۔ سابق انچارج صاحب کئی ایک کام ادھورے چھوڑ گئے ہیں، بس انہی میں سر کھپا رہا ہوں۔ آپ کی طرف آنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔''

میں چودھری سے وقوعہ کے بارے میں کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ ڈاکٹر وہاں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے سلام دعا کرنے کے بعد چودھری فیروز کا تفصیلی معائنہ کیا پھر تسلی بھرے لہجے میں بولا۔

''پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے چودھری صاحب۔ آپ کو مزید ایک دن اسپتال میں رہنا ہوگا۔ کل ہم دوبارہ آپ کے زخم کا جائزہ لینے کے بعد پکی پٹی کر دیں گے۔ موسم ٹھنڈا ہے اس لیے زخم کے خراب ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ بس ہفتے میں ایک بار اسپتال آ کر پٹی کروا لیا کریں۔ انشاء اللہ مہینے بھر میں آپ کا زخم ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جو دوائیں لکھ کر دے رہا ہوں وہ آپ نے نہایت پابندی کے ساتھ کھانا ہیں......'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! میں مانتا ہوں کہ یہ ایک پولیس کیس تھا لیکن رات کو دو بجے چودھری صاحب کو یہاں لایا گیا تھا اور ان کی حالت ایسی تھی کہ اگر اس واقعے کی ایف آئی آر کے اندراج کا انتظار کیا جاتا تو چودھری صاحب کی زندگی کو کوئی بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ کٹی ہوئی ٹانگ میں سے خون بڑی تیزی سے نکل رہا تھا۔ آپ ہماری مجبوری کو سمجھ سکتے ہیں......!''

''کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ڈاکٹر صاحب!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ نے جو بھی کیا، خوب کیا۔ تمام قانون اور قاعدے انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں لہٰذا یہ انسان سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتے۔ جب کسی انسان کی جان بچانے کے لیے حرام چیز کا استعمال بھی حلال قرار پاتا ہے تو یہ چھوٹی موٹی قانونی بے قاعدگیاں کیا معنی رکھتی ہیں؟ انسان اور انسانیت کی تقدیم ضروری ہے۔ باقی سب کچھ اس کے بعد......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا۔

''میں ذرا چودھری صاحب سے ضروری پوچھ تاچھ کر لوں پھر فارغ ہو کر آپ کے پاس آتا ہوں تاکہ اگر کسی کاغذی کارروائی کی ضرورت ہو تو اسے پورا کر لیا جائے۔''

ڈاکٹر نے میرا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہو گیا۔

میں نے چودھری فیروز سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''چودھری صاحب! اگر آپ کو بات چیت میں کوئی دقت یا دشواری محسوس نہ ہو رہی ہو تو میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہوں گا۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں ملک صاحب......'' وہ ہمت دکھاتے ہوئے بولا۔ ''آپ پوچھیں، جو بھی پوچھنا ہے۔''

''مگر...... میں آپ سے بالکل علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''امجد! تم باہر جا کر بیٹھو۔'' میں نے اپنے کانسٹیبل سے کہا پھر چودھری انعام کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اور تم بھی برخوردار......!''

''میں اباجی کی اولاد ہوں۔ ان کا سگا بیٹا ہوں۔'' چودھری انعام نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ''مجھ سے کیا پردہ؟''

''انعام!'' چودھری فیروز نے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''ملک صاحب جو کہہ رہے ہیں اس پر عمل کرو۔''

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے طوعاً و کرہاً کمرے سے نکل گیا۔ امجد اس سے پہلے ہی جا چکا تھا۔ میں چودھری فیروز کی جانب متوجہ ہو گیا اور سرسری انداز میں کہا۔

''چودھری صاحب! میں آج صبح تھانے میں چودھری اکرام سے مل چکا ہوں اور ابھی چودھری انعام کا موڈ بھی دیکھ لیا۔ آپ کے دونوں بیٹوں کی فطرت اور مزاج میں زمین آسمان کا تفاوت ہے۔ اکرام پانی ہے اور انعام آگ...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جناب۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں خود انعام کی وجہ سے فکرمند رہتا ہوں۔ یہ بڑی غصیلی طبیعت کا مالک ہے۔ ہر وقت لڑنے اور مارنے مرنے پر تلا رہتا ہے۔ سیانے سچ ہی کہتے ہیں، ایسے جذباتی اور جلد باز پستہ قامت

لوگوں کی مت گِٹوں (ٹخنوں) میں بیٹھ جاتی ہے۔ کبھی عقل سے کام ہی نہیں لیتے......!''

''جذباتی ہونا کوئی بری بات نہیں چودھری صاحب!'' میں نے کہا۔ ''یہ تو انسان کے زندہ ہونے کی دلیل ہے۔ بس جذبات پر قابو ہونا ضروری ہے۔''

چودھری فیروز نے انعام کو پستہ قامت اس لیے کہا تھا کہ اکرام کی بہ نسبت اس کا قد کافی کم تھا اور یہ اکرام کی طرح دبلا پتلا بھی نہیں بلکہ بھرے بھرے بدن کا مالک تھا تاہم گِٹوں میں مت بیٹھ جانے والا محاورہ اس نے غلط بول دیا تھا۔ دراصل حد سے زیادہ طویل القامت ''لم ڈھینگ'' ٹائپ افراد کے لیے بولا جاتا ہے کہ ان کی عقل کھوپڑی میں نہیں، گِٹوں میں ہوتی ہے۔

''بس جی، اللہ ہی انعام کو ہدایت دے......!''

چودھری نے میری بات کے جواب میں کہا۔ ''وہ اٹھتے بیٹھتے بس ایک ہی بات کررہا ہے کہ کسی طرح اس بندے کا پتا چل جائے جس نے مجھے اس حال کو پہنچایا ہے پھر وہ اس بدبخت کے ٹکڑے کرکے چیل کوؤں کو کھلا دے گا۔''

''چودھری صاحب! اللہ کا شکر کہ آپ زندہ سلامت ہیں۔'' میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ اس واقعے کو معمولی نہ سمجھیں۔ کوئی شخص آپ کی حویلی میں گھس کر آپ کی ٹانگ کاٹ لے گیا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بندہ آپ سے شدید نوعیت کی نفرت کرتا ہے۔ آخر وہ کون ہوسکتا ہے؟''

''یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں بھی نہیں آئی ملک صاحب!'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں تو اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ اچانک میری آنکھ کھلی تو میں نے کمرے میں تین افراد کو دیکھا۔ انہوں نے ڈھاٹوں سے اپنے چہروں کو چھپا رکھا تھا۔ دو کے ہاتھوں میں مجھے دونالی بندوقیں دکھائی دیں جبکہ تیسرے نے تیز دھار والا ایک خطرناک بُغدا پکڑ رکھا تھا، جیسا کہ قصابوں کے پاس ہوتا ہے جس سے وہ گوشت کا قیمہ بناتے ہیں۔ میرا خیال ہے اسی بُغدے کی مدد سے ان ظالموں نے میری ٹانگ کاٹی ہے......''

بات ختم کرکے چودھری نے ایک جھرجھری لی پھر سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''آپ کا خیال کیوں ہے...... آپ یقین سے کیوں نہیں کہہ رہے کہ ان لوگوں نے بُغدے ہی سے آپ کی ٹانگ کاٹی ہے؟''

''دراصل بات یہ ہے کہ انہوں نے مجھے کچھ دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔'' چودھری فیروز وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میری جیسے ہی ان پر نگاہ پڑی، انہوں نے مجھے بالکل اندھا اور گونگا بنا دیا تھا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں چودھری صاحب......'' میں نے الجھن آمیز انداز میں کہا۔ ''ان لوگوں کے پاس ایسا کون سا جادو تھا کہ آپ دیکھنے اور بولنے کی صلاحیت کھو بیٹھے تھے؟''

''وہ کوئی جادو نہیں بلکہ تکیے کے غلاف کی طرح کا ایک تھیلا تھا جس کے ایک سرے پر شلوار کے جیسا نیفا بنا ہوا تھا اور اس نیفے کے اندر ڈوری بھی ڈلی ہوئی تھی۔'' اس نے سمجھانے والے انداز میں بتایا۔ ''بس انہوں نے آناً فاناً میں وہ غلاف میرے سر پر چڑھایا اور اس کی ڈوری کو کس کر میرے حلق پر باندھ دیا اور میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر دبا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے بڑی بے دردی سے بُغدے کا استعمال کرکے میری ٹانگ کاٹی اور...... یہ جا، وہ جا!''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ''کیا آپ اس کمرے میں اکیلے ہی سو رہے تھے۔ میرا مطلب ہے ......آپ کی اہلیہ کہاں تھیں؟''

''کبریٰ سے آج کل میری ان بن چل رہی ہے۔'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ''اسی وجہ سے ہماری خوابگاہیں بھی الگ ہوگئی ہیں۔''

''اوہ......!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''ٹھیک ہے کہ آپ ان تین حملہ آور افراد کے چہرے نہیں دیکھ سکے۔ ان لوگوں نے آپ کی قوت گویائی پر بھی پہرے بٹھا دیے تھے لیکن آپ کے کان تو کھلے تھے۔ کیا اس دوران میں آپ نے انہیں آپس میں بات چیت کرتے سنا؟''

''ہاں، وہ ایک دوسرے سے بات تو کررہے تھے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں ان لمحات میں تکلیف کی جس شدت سے گزر رہا تھا، اس نے مجھے ان کی طرف دھیان نہیں دینے دیا مگر......!''

وہ یکایک بولتے بولتے رک گیا اور الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔

''مگر کیا چودھری صاحب؟ آپ اچانک خاموش کیوں ہوگئے......؟''

''ہوسکتا ہے یہ میرا وہم ہو......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''لیکن مجھے لگتا ہے کہ ان تینوں میں سے

ایک کی آواز میری جانی پہچانی تھی......''

''جانی پہچانی آواز کا تو یہ مطلب ہوا کہ آپ اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہیں۔'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے بتائیں آپ کا شک کس پر ہے۔ اس وقت ہم مکمل اندھیرے میں کھڑے ہیں چودھری صاحب۔ آپ روشنی کی کرن دکھائیں گے تو یہ تاریکی چھٹے گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری بات کو اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔''

''اگر میں غلط نہیں تو وہ ماجھا تھا......!'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''کون ماجھا؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''ایک مفرور قیدی......'' وہ خواب ناک انداز میں بولا۔ ''اس کا اصل نام معراج دین ہے لیکن سب اسے ''ماجھا'' ہی کہتے ہیں۔ وہ ظفر گڑھ ہی کا وسنیک تھا۔ دو سال پہلے اس نے گاؤں کے ایک بندے نیاز احمد کو قتل کر دیا تھا اور عدالت نے اسے عمر قید کی سزا سنا دی تھی۔''

''جب ماجھا جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہے تو پھر وہ ''مفرور قیدی'' کیسے ہوا چودھری صاحب؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ عرصہ پہلے سننے میں آیا تھا کہ ماجھا جیل سے فرار ہو گیا ہے۔'' اس نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔ ''میری معلومات کے مطابق ماجھا جیل میں شدید بیمار پڑ گیا تھا اور جیل کی ڈسپنسری میں اس کا علاج ممکن نہیں رہا تھا لہٰذا اسے کڑی نگرانی میں جیل سے شہر کے اسپتال لے جانے کا فیصلہ کیا گیا لیکن راستے میں ماجھا کے حمایتی خیر خواہوں نے ان کے تانگے پر حملہ کیا اور سرکاری اہلکاروں کو زیر کرنے کے بعد وہ لوگ ماجھا کو چھڑا لے گئے۔ قانون نے ماجھا کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔ ایک افواہ یہ بھی ہے کہ ماجھا نے ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شمولیت اختیار کر لی ہے......''

''ہوں......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر چودھری فیروز کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔ ''چودھری صاحب! اگر یہ کہانی صد فیصد درست بھی ہو تو پھر آپ کو بہ خوبی اندازہ ہونا چاہیے کہ ایک ڈاکو کی زندگی گزارنے والے ماجھے نے آپ کی حویلی کو کیوں نشانہ بنایا؟ اس نے آپ کو نمونۂ عبرت بنا کر کون سی دشمنی نکالی ہے......؟''

میرے اس سنسنی خیز استفسار نے چودھری کے چہرے پر زلزلے کے آثار پیدا کیے۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ ماجھے کے حوالے سے اس کے ذہن میں اچھا خاصا مواد موجود تھا۔

''میرا ذہن تو نیاز احمد کی طرف ہی جا رہا ہے ملک صاحب!'' وہ ہونٹ بھینچ کر بولا۔ ''ماجھا ایک خرد ماغ انسان ہے۔ دل میں بے پناہ غل و غش رکھنے والا۔ یہ اس کی کدورت کا شاخسانہ ہو سکتا ہے۔''

چودھری فیروز کوئی بھی بات یقین کے ساتھ نہیں کر رہا تھا۔ مجھے اس کے انداز پر شک گزرا لیکن میں نے اپنی سوچ کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور کریدنے والے انداز میں کہا۔

''آپ کا ذہن نیاز احمد کی طرف کیوں جا رہا ہے؟ نیاز کا آپ سے ایسا کیا ناتا ہے کہ ماجھا کو یہ تنفر آمیز قدم اٹھانا پڑا؟''

''نیاز احمد میرا بندہ تھا ملک صاحب......'' وہ ایک بوجھل سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''ماجھا اور نیاز میں ادھر کھیتوں میں کام کرتے ہوئے تھکا فضیحتی ہو گئی تھی اور ماجھے نے طیش میں آ کر نیاز کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب ماجھا کو گرفتار کیا گیا تو وہ مجھ سے یہ توقع کر رہا تھا کہ میں اسے بچانے کی کوشش کروں گا لیکن میں نے حق کا ساتھ دیا۔ اس طرح ماجھا عدالت سے عمر قید کی سزا پا کر جیل چلا گیا تھا۔ بس یہی ایک نکتہ ہے کہ ماجھا اپنے دل و دماغ میں میرے لیے انتقامی سوچ رکھ سکتا ہے...... یہ میرا اندازہ ہے ملک صاحب جو کہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ میں آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا تھا اس لیے سب بتا دیا......''

چودھری فیروز نے مجھے جو معلومات فراہم کیں اس کے پیچھے اس کے کیا مقاصد کارفرما تھے، مجھے اس کا قطعاً اندازہ نہیں تھا کیونکہ نیت کا حال اور دل کا احوال صرف خدا جانتا ہے۔ بہر حال اس گفتگو سے مجھے سوچنے کے لیے ایک راستہ مل گیا تھا۔ میرے دماغ میں ایسی کھڑکی کھل گئی تھی جس سے جھانک کر میں حقیقت تک بہ آسانی رسائی حاصل کر سکتا تھا۔

''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں چودھری صاحب!'' میں نے تشفی بھرے انداز میں کہا۔ ''میں بہت جلد حقائق کی تہ میں اتر کر اس معمے کو حل کر لوں گا پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ آپ کے ساتھ زیادتی کرنے والا چاہے ماجھا ہو یا کوئی اور...... وہ قانون کی پکڑ سے بچ نہیں سکے گا۔''

جس طرح چودھری فیروز نے گھما پھرا کر بات کی تھی، میں نے بھی ویسے ہی اسے کمسن گھیریوں میں ڈال دیا تھا۔ اس نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! میں ایک وقیع اور خاندانی شخص

ہوں۔ گزشتہ کئی پشتوں سے ہمارا خاندان ظفر گڑھ پر راج کر رہا ہے۔ اس گاؤں کا نام میرے دادا چودھری ظفر کے نام پر ہے۔ ظفر گڑھ اور اس سے باہر بھی ہر کوئی ہمارا احترام کرتا ہے۔ آج تک کسی کی اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ ٹیڑھی آنکھ سے ہماری طرف دیکھے اور...... اس نامراد نے میری حویلی میں گھس کر یہ قیامت ڈھائی ہے...... آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ وہ خبیث جب بھی آپ کے ہتھے چڑھے گا تو آپ اسے میرے حوالے کریں گے...... میں اس ذلیل انسان کو ایسی دردناک موت سے ہمکنار کروں گا کہ رہتی دنیا تک لوگ اس کے حشر کو یاد رکھیں گے اور...... اس سے عبرت پکڑیں گے......!''

میں چونکہ اس سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چودھری صاحب! آپ اپنے دماغ پر زیادہ دباؤ نہ ڈالیں۔ اس وقت آپ کو آرام کی اشد ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس ظالم کو بہت جلد اپنی گرفت میں لے لوں گا پھر وہ بدبخت قرار واقعی سزا سے بچ نہیں سکے گا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ میں اسے تسلی تشفی دے کر سمندری کے جنرل اسپتال سے نکل آیا۔

☆☆☆

وہ ایک کشادہ خواب گاہ تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کمرے کی پیمائش پندرہ بائی پندرہ فٹ رہی ہوگی۔ کمرے کے وسط میں ایک کنگ سائز پلنگ بچھا ہوا تھا جس پر موسم کی مناسبت سے گرم بستر موجود تھا۔ مذکورہ بستر کے بیشتر حصے خون آلود تھے۔ پلنگ کے پہلو میں کمرے کے فرش پر بھی خون پھیلا ہوا تھا اور اسی خون میں مجھے ایک چوبی منڈھی (مُڈی) بھی پڑی دکھائی دی جس کی بالائی سطح پر بھی خون لگا ہوا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ چودھری فیروز کی بائیں ٹانگ کو اسی منڈھی (درخت کے تنے کا وہ گول حصہ، قصاب جس پر گوشت کو رکھ کر کاٹتے ہیں اسے منڈھی یا مُڈی یا کٹنگ بورڈ بھی کہا جاتا ہے) پر رکھ کر بُغدے کی مدد سے کاٹا گیا تھا۔ بعد ازاں حملہ آور چودھری کو کٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ بستر پر پھینک کر وہ وہاں سے چلے گئے تھے۔

مذکورہ کمرے میں دو دروازے اور ایک بڑے سائز کی کھڑکی تھی۔ ایک دروازہ حویلی کے اندرونی حصے میں کھلتا تھا جسے چودھری نے اندر سے بند کر رکھا تھا جبکہ دوسرے دروازے کے سامنے حویلی کا کشادہ صحن تھا۔ اسی دروازے والی دیوار میں سابق الذکر کھڑکی بھی تھی۔ اس کھڑکی کے تمام پٹ اندر سے بند تھے تاہم صحن کی جانب کھلنے والے دروازے کو باہر سے بند کیا گیا تھا اور یہ کام چودھری اکرام نے میری ہدایت پر کیا تھا۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ حملہ آور اسی دروازے سے گزرنے کے بعد چودھری فیروز تک پہنچے تھے۔ گویا حملہ آوروں کو اس امر کا بہ خوبی علم تھا کہ ان دنوں چودھری فیروز اس کمرے میں سویا کرتا تھا اور...... میرے نزدیک یہ ایک اہم نکتہ تھا...... نہایت ہی قابلِ غور اور توجہ طلب۔

حملہ آوروں نے بڑی باریک بینی سے منصوبہ بندی کی تھی ورنہ چودھری فیروز کی دولی میں گھسنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی حکمتِ عملی سے یہ مشکل کام کر دکھایا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر وہ تین ڈھاٹا پوش اس حویلی کی سیکیورٹی کو انگشت نما کر چلے گئے تھے۔ چودھری فیروز کی تولیت پر اس واقعے نے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ثبت کر دیا تھا۔

جائے وقوعہ کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں چودھری اکرام اور اس کی والدہ چودھرائن کبریٰ بیگم کو ساتھ لے کر حویلی کی کشادہ بیٹھک میں آگیا۔ چودھری اکرام سے آج صبح تھانے میں میری ایک مختصر سی ملاقات ہو چکی تھی تاہم ابھی بہت کچھ پوچھنا باقی تھا لہٰذا میں نے ان ماں بیٹے کو اپنے سامنے بٹھا لیا تھا۔

''چودھری صاحب کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے وہ کم ہے۔'' میں نے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ ان کی جان بچ گئی۔ میں ابھی اسپتال میں ان سے طویل ملاقات کر کے آرہا ہوں۔ وہ کل گھر آجائیں گے۔''

''صرف مذمت کافی نہیں ہے تھانے دار صاحب......!''
کبریٰ بیگم نے میرے اظہارِ افسوس کے جواب میں ایک افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''جب تک اثیم کو اس کے عمل کی سزا نہیں ملے گی، مجھے سکون نہیں آئے گا۔''

چودھرائن کی عمر لگ بھگ پینتالیس سال رہی ہوگی۔ میری مصدقہ معلومات کے مطابق اس کی تین اولادیں تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی عالیہ تھی جس کی عمر چوبیس کے اریب قریب تھی۔ عالیہ دو بچوں کی ماں تھی جن میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ عالیہ کی شادی جھنگ صدر کے ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس کے شوہر کا نام چودھری توفیق احمد تھا۔ عالیہ سے چار سال چھوٹا اکرام اور اکرام سے دو سال چھوٹا انعام تھا۔ چودھری فیروز پچاس کا ہندسہ عبور کر چکا تھا مگر وہ کبریٰ کے مقابلے میں عمر رسیدہ لگتا تھا۔ کبریٰ

نانی بن چکی تھی تاہم وہ عالیہ کی بڑی بہن دکھائی دیتی تھی۔

''چودھرائن جی! میری دلی خواہش بھی یہی ہے۔'' میں نے کبریٰ بیگم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''گناہ گار کو عبرت ناک سزا دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ قانون کی گرفت میں آجائے اور یہ آپ لوگوں کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں......!''

ماں بیٹے نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر بہ یک زبان ہو کر مجھ سے مستفسر ہوئے۔ ''آپ ہم سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں تھانے دار صاحب؟''

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں انہیں چودھری فیروز سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا اور آخر میں کہا۔ ''چودھری صاحب کو شک ہے کہ ان تین حملہ آوروں میں ایک معراج دین عرف ماجھا بھی تھا لیکن وہ ماجھا سے اپنی دشمنی کی تسلی بخش وضاحت نہیں کر سکے۔ انہوں نے کسی نیاز احمد کی ہلاکت کا بھی ذکر کیا تھا مگر سچی بات یہ ہے کہ میں ماجھا کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ یہ تمام تر معلومات آپ ماں بیٹا مجھے فراہم کریں گے لیکن اس سے بھی پہلے......'' میں نے براہِ راست چودھرائن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو میرے چند سوالات کے ٹھیک ٹھیک جواب دینا ہوں گے......!''

''جی، آپ پوچھیں!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''چودھری صاحب اس کمرے میں اکیلے کب سے سو رہے تھے؟''

''یہی کوئی چار پانچ دن سے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یا زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے سے......''

''چودھری صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ اس علیحدہ شب بسری کا سبب آپ سے ہونے والی ناچاقی تھی؟'' میں نے چودھرائن کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے استفسار کیا۔

''انہوں نے آپ کو غلط نہیں بتایا تھانے دار صاحب!'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''وہ جب بھی مجھ سے خفا ہوتے ہیں تو یہی کرتے ہیں۔ بات بڑی ہو یا چھوٹی، ان کا یہی وتیرہ ہے۔ وہ چند روز کے لیے الگ کمرے میں سونا شروع کر دیتے ہیں۔''

''اب کی بار بات چھوٹی تھی یا بڑی؟''

''میری نظر میں تو معمولی ہی تھی۔'' وہ سادگی سے بولی۔ ''چودھری صاحب کے دل میں کیا ہے، یہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔''

''کیا میں اس متنازع فیہ کے بارے میں کچھ جان سکتا ہوں؟'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے بتائیں۔ اس مرتبہ چودھری صاحب کس بات پر آپ سے ناراض ہو گئے تھے......؟''

''ہمارے درمیان اکرام کے رشتے کے حوالے سے بات ہو رہی تھی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میری خواہش ہے کہ میں اپنی بہن صغریٰ کی بیٹی فاخرہ کو بہو بنا کر اس حویلی میں لاؤں مگر چودھری صاحب میرے بہنوئی کو دل سے پسند نہیں کرتے اس لیے وہ اس رشتے کے حق میں بالکل نہیں ہیں۔ میں نے اپنی بات کے حق میں دلائل دینا شروع کیے تو بس وہ غصے میں آگئے اور اگلی رات سے انہوں نے اپنی خواب گاہ الگ کر لی۔ اب آپ بتائیں تھانے دار صاحب......میں کہاں پر غلط ہوں؟''

بات کے اختتام پر اس نے بال میری کورٹ میں پھینک دی تو میں نے اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں آپ قصوروار نہیں ہیں۔ ایسی ذرا ذرا سی باتوں پر اینڈنا، اینٹھنا اور روٹھنا انتہائی نامناسب اور غیر ضروری ہے۔''

''یہی تو میں بھی کہتی ہوں مگر میری بات چودھری صاحب کی سمجھ میں نہیں آتی۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''اس حویلی میں صرف اور صرف انہی کا حکم چلتا ہے۔ جب کوئی انہیں اپنی مرضی کرنے سے روک نہیں سکتا تو پھر ناراضی دکھانے کی کیا تک ہے؟''

میں نے فروعی باتوں سے اجتناب برتتے ہوئے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔ ''کیا حویلی میں رہنے والے ہر شخص کو اس بات کا علم تھا کہ چودھری صاحب نے ان دنوں آپ سے عارضی افتراق قائم کر رکھا ہے اور وہ الگ کمرے میں سوتے ہیں؟''

''جی بالکل، سب جانتے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''حویلی کے وسنیک چودھری صاحب کی اس عادت سے بہ خوبی واقف ہیں کیونکہ مہینے، دو مہینے میں انہیں یہ تماشا دیکھنا پڑتا ہے......''

ہمارے درمیان سنجیدہ گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ایک ملازم اشیائے خورونوش سے لدی پھندی ایک کنگ سائز ٹرے اٹھا کر وہاں پہنچ گیا۔ مذکورہ ملازم نے ٹرے کو سینٹر ٹیبل پر رکھا اور خاموشی کے ساتھ ڈرائنگ روم سے رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد کبریٰ بیگم کے ہدایت نما حکم پر چودھری اکرام میری خاطر داری کے لیے سرگرم عمل ہو گیا۔

''چودھرائن جی! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر چھوٹے چودھری سے

مخاطب ہوتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''اکرام! میرے لیے بس تھوڑے سے نمکین پتے نکال دو۔ میں چائے پیوں گا اور چند دانے پستے کے چگ لوں گا۔''

چودھری اکرام نے فوراً میری ہدایت پر عمل کر دیا۔

''چودھرائن جی......'' میں نے گفت وشنید کے ٹوٹے ہوئے تسلسل کو بحال کرتے ہوئے کبریٰ بیگم سے استفسار کیا۔ ''حویلی کے دسنیکوں کی جان کاری کے بارے میں تو آپ نے بتا دیا۔ حویلی سے باہر ظفر گڑھ میں رہنے والے لوگوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گی؟ کیا انہیں بھی اس راز سے آگاہی حاصل تھی؟ میں آپ سے یہ سوال ایک خاص مقصد سے کر رہا ہوں......!''

''میں دعوے اور یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ہو سکتا ہے چند پنڈ والے بھی یہ بات جانتے ہوں۔''

''اکرام! تمہارا کیا خیال ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے چھوٹے چودھری کی طرف دیکھا۔

''دیکھیں تھانے دار صاحب......!'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''چونکہ یہ ابا جی کی بہت پرانی عادت ہے اس لیے عین ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو اس کا علم ہو۔''

''آپ نے کس خاص مقصد سے یہ سوال کیا تھا؟'' چودھرائن نے مجھ سے پوچھا۔

''حویلی کے اندر رہنے والے لوگ ہوں یا حویلی سے باہر ظفر گڑھ میں بسنے والے افراد، اگر ان میں سے کچھ کو یا بہت سوں کو چودھری صاحب کی اس ادائے خفگی کا علم ہے تو اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں۔'' میں نے باری باری ان کے چہروں کو تکتے ہوئے کہا۔ ''خرابی کی بات یہ ہے کہ چودھری صاحب کی ٹانگ کاٹنے والے کو ٹھیک پتا تھا کہ آج کل چودھری اور چودھرائن میں ان بن چل رہی ہے اور چودھری فیروز الگ کمرے میں شب بسری کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ حملہ آور یہاں تک باخبر تھے کہ ان کا شکار کس کمرے میں گہری نیند کے مزے لوٹ رہا ہوگا لہٰذا وہ سیدھے اسی کمرے میں پہنچے اور اپنا مذموم مقصد پورا کرنے کے بعد واپس چلے گئے......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کام ماجھا کا ہے یا کسی اور کا، وہ ہر حال میں سخت ترین سزا کا مستوجب ہے اور اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اس کے مخبر کا پکڑا جانا بہت ضروری ہے۔ اب آپ لوگ مجھے بتائیں کہ ایسی گھٹیا حرکت کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟''

''مجھے تو کوئی اندازہ نہیں ہے......'' اکرام بے بسی سے بولا۔

کبریٰ بیگم نے کہا۔ ''میں بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔''

''تو جاننے کی کوشش کریں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت ضروری ہے۔ جس کسی نے بھی چودھری صاحب کی ٹانگ کاٹی ہے، اسے بہ خوبی یہ علم تھا کہ ان دنوں چودھری صاحب بالکل الگ تھلگ ایک کمرے میں اکیلے سوتے ہیں۔ اگر ہم حملہ آوروں کے مخبر تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر چودھری صاحب کے دشمن کو پکڑنا بہت آسان ہو جائے گا۔'' میں نے ذرا دیر کو رک کر باری باری ان دونوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر معتدل انداز میں پوچھا۔

''میری بات آپ لوگوں کی سمجھ میں تو آ گئی ہے نا؟''

''جی...... میں سمجھ گئی۔'' کبریٰ نے اثبات میں جواب دیا۔

اکرام نے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! ہم آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔''

''ٹھیک ہو گیا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب آپ لوگ مجھے ماجھا کے بارے میں بتائیں۔''

وہ شروع ہو گئے۔ اس روز چودھری اکرام اور اس کی والدہ چودھرائن کبریٰ بیگم کی زبانی مجھے معراج دین عرف ماجھا کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

ماجھا کا باپ سراج دین موضع ظفر گڑھ کا پرانا دسنیک تھا۔ اس کی صرف دو ہی اولادیں تھیں۔ ایک بیٹا ماجھا اور ایک بیٹی شاداں۔ ماجھا، شاداں سے پانچ سال بڑا تھا جس کی عمر اس وقت پچیس سال تھی۔ سراج دین کی بیوی صفیہ ایک نابینا عورت تھی۔ وہ پیدائشی اندھی نہیں تھی۔ اوائل عمری میں آنکھوں کی ایک خطرناک بیماری نے اس کی بینائی چھین لی تھی۔

سراج دین کے پاس پانچ ایکڑ زرعی اراضی تھی۔ ماجھا اپنے باپ کے ساتھ اس زمین پر کھیتی باڑی کرتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ آوارگی کے لیے بھی کافی وقت نکال لیا کرتا تھا۔ ماجھا گاؤں ہی کی ایک لڑکی تاجی سے محبت بھی کرتا تھا۔ واضح رہے کہ میں اس وقت آپ لوگوں کی خدمت میں اکرام اور کبریٰ کا نقطۂ نظر پیش کر رہا ہوں......!

ان ماں بیٹے کے مطابق سراج دین نے چودھری صاحب سے کچھ رقم ادھار لے رکھی تھی مگر وہ حسب وعدہ رقم

نہیں لوٹا پایا تھا جس پر چودھری صاحب نے پہلے تو خفگی کا اظہار کیا پھر ایک روز اسے خوب ڈانٹا ڈپٹا۔ چودھری صاحب نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ کچھ بھی کرے مگر ایک ماہ میں ان کی رقم لوٹا دے۔

ابھی ایک ماہ کا عرصہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ کھیتوں میں ماجھا کی چودھری کے ایک ملازم نیاز احمد سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ ماجھا اپنی زمین کو پانی لگانا چاہتا تھا اور نیاز احمد اسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ نیاز احمد کا کہنا یہ تھا کہ وہ یہ سب کچھ چودھری صاحب کے حکم پر کر رہا ہے۔ چودھری صاحب نے کہا ہے کہ جب تک سراج دین ان کا قرضہ واپس نہیں کر دیتا، اسے اپنی زمین میں کاشت کاری کی اجازت نہیں۔

دونوں کے بیچ تلخ کلامی کا سلسلہ آگے بڑھا اور ہرزہ سرائی تک جا پہنچا پھر وہ ہزلیات پر اتر آئے۔ ماجھا نے اس وقت ہاتھ میں کسّی (پھاوڑا) پکڑ رکھی تھی۔ جب نیاز نے ماجھا کی ماں اور بہن کو مغلظات میں تولنا شروع کیا تو اس کی برداشت جواب دے گئی اور پھر اس کا کسّی والا ہاتھ حرکت میں آ گیا۔ اس نے طیش کے عالم میں نیاز کے سر پر کسّی کے کئی وار کیے۔ نتیجتاً نیاز کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند زمیں بوس ہو گیا اور موقع پر ہی اس کی موت واقع ہوگئی۔ نیاز کے قتل کے جرم میں ماجھا عمر قید کی سزا پا کر جیل چلا گیا تھا۔ یہ واقعہ دو سال پہلے کا تھا۔

آئندہ دو سالوں میں ماجھا کا خاندان تین تیرہ ہو گیا۔ وہ خود تو عمر قید کی سزا کاٹنے جیل کی بلند و بالا سنگلاخ دیواروں کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں پہلے اس کے باپ کی موت ہوئی۔ اس کے بعد ان کے گھر پر ایک رات ڈاکوؤں نے حملہ کیا۔ اس گھر میں لوٹنے کے لیے کچھ بھی نہیں رکھا تھا۔ وہ ڈاکو دراصل ماجھا کی بہن شاداں کو اٹھانے آئے تھے۔ نابینا ماں نے مزاحمت کی برائے نام کوشش کی تو ڈاکوؤں نے اس کے سینے میں برچھی اتار کر اسے موقع پر ہی ٹھنڈا کر دیا۔ شاداں اپنی جان بچانے کے لیے مکان کی چھت پر پہنچ گئی مگر ڈاکوؤں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ شاداں ان لمحات میں "نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن" ایسی صورتِ حال میں گھر گئی تھی۔ اپنی جان اور عزت کو بچانے کے لیے اسے موت کا راستہ ہی نظر آیا۔ بس پھر وہ چھت سے کود گئی تھی......!

میں مزید دس منٹ تک حویلی میں رکا پھر اکرام اور کبریٰ کو ضروری ہدایات دے کر وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆

ان ماں بیٹے سے حاصل ہونے والی معلومات کی صحت کو چیک کرنا ضروری تھا لہٰذا تھانے پہنچ کر میں نے حوالدار خادم حسین کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ خادم حسین ایک سمجھ دار اور سنجیدہ طبع پولیس اہلکار تھا اور اپنے کام کا ماہر بھی......!

خادم حسین نے کمرے میں آ کر مجھے سلام کیا پھر میرے اشارے پر وہ میز کی دوسری جانب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

"خادم حسین!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔ "چودھری فیروز کو پیش آنے والے واقعے کے حوالے سے مجھے ایک اشارہ ملا ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اس پر روشنی ڈالو......"

"آپ حکم کریں ملک صاحب۔" وہ ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے بولا۔ "میں حاضر ہوں جناب۔"

"چودھری کو یہ شک ہے کہ ان حملہ آوروں میں ایک ماجھا بھی تھا۔" میں نے کہا۔ "وہی ماجھا جو کچھ عرصہ پہلے جیل سے اسپتال لے جاتے ہوئے راستے میں فرار ہو گیا تھا۔ میرا مطلب ہے، ماجھا کے حمایتی اسے پولیس کی تحویل سے چھڑا لے گئے تھے اور آج کل ماجھا اپنے انہی حمایتی ڈاکوؤں کے گروہ کا حصہ ہے......!"

خادم حسین نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب! چھ ماہ پہلے ماجھا پولیس کی تحویل سے فرار ہو گیا تھا۔ اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن ایسی کوئی بھی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکی۔ اس علاقے میں کئی میل تک گھنا جنگل پھیلا ہوا ہے جو ڈاکوؤں کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ کی حیثیت کا حامل ہے۔ وہ لوگ قانون کی نگاہ سے بچنے کے لیے جنگل کے اندرونی حصے میں بہ آسانی مستور ہو جاتے ہیں۔ باقی جہاں تک ماجھا کا معاملہ ہے تو......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"یہ تو سننے میں آتا ہے کہ فرار ہونے کے بعد ماجھا نے ڈاکوؤں کے گروہ میں شمولیت اختیار کر لی تھی لیکن ابھی تک اس کا کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہیں آیا۔ آج میں پہلی بار آپ کی زبان سے سن رہا ہوں۔"

"یہ میری نہیں بلکہ چودھری فیروز کی زبان کے الفاظ ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اس نے ماجھا کی اس بہیمانہ انتقامی کارروائی کا ایک سبب بھی بتایا ہے۔"

''کیا کہتا ہے چودھری فیروز؟'' حوالدار نے پوچھا۔
میں نے چودھری کے خیالات کو حوالدار تک پہنچانے کے بعد کہا۔ ''خادم حسین! میں ابھی حویلی میں چودھری فیروز کے بڑے بیٹے اور چودھرائن سے ایک تفصیلی ملاقات کر کے آ رہا ہوں اور انہوں نے مجھے ماجھا کی جو کہانی سنائی ہے وہ چودھری کی سوچ کی عکاسی کرتی ہے لیکن میں آنکھیں بند کر کے اس کہانی پر یقین نہیں کر سکتا۔ تمہیں یہاں بلانے کا مقصد یہی ہے کہ میں حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔ تم پچھلے بارہ سال سے اس تھانے میں ہو۔ سابق تھانہ انچارج فیض محمد صاحب کا زمانہ تم نے اچھی طرح دیکھ رکھا ہے۔ ماجھا دو سال پہلے عدالت سے عمر قید کی سزا پا کر جیل گیا تھا، نیاز احمد کے قتل کے الزام میں۔ آپ لوگوں نے ہی ماجھا کو گرفتار کیا تھا اور پھر چالان تیار کر کے اسے حوالۂ عدالت کیا تھا لہٰذا اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ تم ماجھا اور اس کے پس منظر سے بہ خوبی آگاہ ہو......''
''ملک صاحب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ چودھری اکرام اور اس کی ماں نے آپ کو ماجھا کی کون سی کہانی سنائی ہے۔ اس کے بعد ہی میں آپ کے سوال کا تسلی بخش جواب دے سکوں گا۔''
حوالدار کی بات میں وزن تھا چنانچہ آئندہ دس منٹ میں، میں نے اس کی خواہش پوری کر دی۔
''ملک صاحب! ان لوگوں نے آپ سے کئی ایک باتیں چھپائی ہیں۔'' خادم حسین نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اور بعض واقعات کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب نیاز احمد کے قتل کا واقعہ پیش آیا تھا اس وقت تک ماجھا کا کوئی کرمنل ریکارڈ نہیں تھا۔ وہ پہلی مرتبہ کسی قانونی معاملے میں پھنسا تھا لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید ٹھوس حقیقت تھی کہ ماجھا نے ہی نیاز احمد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا لہٰذا وہ سزا سے نہ بچ سکا اور اس کی دو بنیادی وجوہات تھیں۔ نمبر ایک، مقتول نیاز کا مدعی چودھری فیروز جیسا طاقتور شخص تھا۔ نمبر دو، ماجھا نے اپنے بیان حلفی میں اقبالِ جرم کر لیا تھا......'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔
''ماجھا تھانے سے عدالت اور عدالت سے جیل چلا گیا تھا۔ اس نے جو جرم کیا تھا اس کی یہی سزا ہو سکتی تھی۔ فیض محمد صاحب نے ماجھا کے حوالے سے اپنے طور پر بھی بہت کام کیا تھا جس میں سے بہت سی باتیں ماجھا کی فائل کا حصہ نہیں بن سکیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ سابق انچارج صاحب نے دانستہ ایسا کیا تھا یا پھر چودھری فیروز نے کسی قسم کا دباؤ ڈال کر فیض صاحب سے یہ سب کرایا تھا۔ بہرحال اثنائے تجویز جو اہم باتیں سامنے آئیں وہ میرے ذہن میں محفوظ ہیں اور ان میں سے بہت ساری آپ کو سنائی جانے والی کہانی سے لگا نہیں کھاتیں......''
''زبردست خادم حسین!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں وہی حقائق تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔''
''ان دونوں ماں بیٹے نے بڑی ہوشیاری اور تعقید سے کام لیا ہے۔'' حوالدار نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ سچ ہے کہ نیاز احمد کو ماجھا ہی نے قتل کیا تھا لیکن یہ بات درست نہیں کہ ان کے درمیان زمین کو پانی لگانے کے معاملے پر تین پانچ ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ نیاز احمد نے ماجھا کی بہن کے حوالے سے انتہائی رکیک اور نازیبا الفاظ ادا کیے تھے۔ ماجھا، شاداں کے بارے میں نیاز احمد کی بکواس کو برداشت نہ کر سکا اور شدید غصے کے عالم میں اس کا کسّی بردار ہاتھ حرکت میں آ گیا تھا۔ نتیجے کے طور پر نیاز کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس کے علاوہ......'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔
''یہ بھی درست ہے کہ ماجھا کے باپ سراج دین نے اپنے زرعی مسائل کو حل کرنے کے لیے چودھری فیروز سے آٹھ سو روپے ادھار لیے تھے لیکن باوجود کوشش کے بھی وہ چودھری کا قرض چکا نہ سکا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ قرض کی اس رقم نے بچے دینا شروع کر دیے تھے اور وہ بھی انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ چنانچہ محض تین سال میں وہ آٹھ سو روپے، پانچ ہزار روپے کا روپ دھار چکے تھے۔ اتنی بھاری رقم کی ادائیگی سراج دین کے بس میں نہیں تھی لہٰذا وہ آئے روز چودھری کے ہاتھوں اپنی بے عزتی کرواتا رہتا تھا......''
''ایک منٹ خادم حسین!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری بات سے میں یہ سمجھا ہوں کہ چودھری فیروز ضرورت مند افراد کو سود پر قرض دیتا ہے...... میرا اندازہ غلط تو نہیں ہے؟''
''نہیں ملک صاحب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں۔ لوگ اپنی کسی مجبوری سے نمٹنے کے لیے گھر یا زمین کے کاغذات چودھری فیروز کے پاس رکھوا کر قرض لے لیتے ہیں۔ ایسے خوش نصیب بہت ہی کم دیکھنے میں آئے ہیں جو چودھری کا ادھار اتارنے میں کامیاب ہوئے ہوں کیونکہ بیاج کی رقم اتنی تیزی سے بڑھتی ہے کہ قرض دار کے ہوش اڑ جاتے ہیں اور انتہائی بے

بسی کے عالم میں اسے اپنا گھر یا زمین چودھری فیروز کے نام لکھوانا پڑتی ہے۔ اسی گھناؤنے کھیل کی مدد سے چودھری کئی لوگوں کی مختصری زرعی اراضی کو اپنی زمین کا حصہ بنا چکا ہے۔

جس صبح سراج دین اپنے گھر میں مردہ پایا گیا، اس سے پچھلے روز چودھری فیروز نے اسے اپنی حویلی میں بلا کر نہ صرف بری طرح ذلیل کیا تھا بلکہ اس کی پانچ ایکڑ زمین بھی اپنے نام لکھوالی تھی۔ پٹواری، نمبردار...... الغرض ہر متعلقہ شخص کے ساتھ چودھری فیروز نے بنا کر رکھی ہوئی ہے اسی لیے کبھی اس کا کوئی کام رکا نہیں...... سراج دین کا جوان جہاں اکلوتا بیٹا عمر قید کی سزا پا کر جیل جا چکا تھا۔ روزی روٹی کا واحد ذریعہ وہ پانچ ایکڑ زرعی اراضی بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر چودھری فیروز کی ملکیت کا حصہ بن چکی تھی۔ ان حالات میں سراج کو دل کا دورہ نہ پڑتا تو اور کیا ہوتا ملک صاحب......؟''

حوالدار نے لمحاتی توقف کر کے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ ''کیا کبھی کسی نے تھانے آکر چودھری فیروز کے اس ظلم اور زیادتی کے خلاف رپورٹ درج نہیں کرائی؟''

''اتنی جرأت بھلا کون کرے گا ملک صاحب!'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''بے بس اور لاچار دیہاتی چودھری فیروز کے خلاف ہرگز زبان نہیں کھول سکتے۔ سر جی...... آپ ظفر گڑھ کے دسنیکوں کو وہ والے انسان نہ سمجھیں جو جابر حکمراں کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا حوصلہ رکھتے ہوں......!''

خادم حسین کی آواز میں ایک خاص نوعیت کا درد محسوس کر کے میں سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اپنے دل میں مظلوم کے لیے ہمدردی اور ظالم کے لیے بے پناہ غیظ و غضب رکھتا تھا اسی لیے وہ بڑے پُرتاثیر انداز میں ایک کے بعد ایک حقیقت سے پردہ اٹھا رہا تھا۔ میں نے اس کی دلی اور دماغی کیفیت کے پیش نظر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''خادم حسین! میں تمہاری تکلیف کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں تمہارے جذبات کی فصد کھلوانے کا بڑا ہی زبردست بندوبست کروں گا اور یہ بات ذہن میں رکھنا کہ میرا کوئی بھی نشتر کُھٹل نہیں ہے۔ تم دیکھو گے کہ ہم اس علاقے کے گورخروں کو کس طرح دوڑا دوڑا کر ماریں گے......!''

میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! میرے اندر سے یہ آواز آتی ہے کہ میں آپ سے اس قسم کی امید رکھ سکتا ہوں۔ آپ بڑے وکھری ٹائپ کے تھانے دار ہیں......!''

''اور تم بھی کوئی روایتی حوالدار نہیں ہو خادم حسین!'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر توصیفی انداز میں کہا۔ ''مجھے توقع ہے کہ تمہارے ساتھ میری خوب نبھے گی۔ اب ذرا مجھے تم ماجھا کی بہن شاداں کی موت کے بارے میں بتاؤ۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ شاداں نے چھت سے کود کر خودکشی کرلی تھی مگر ڈاکوؤں والی کہانی درست نہیں ہے۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''دراصل چھوٹے چودھری انعام کی شاداں پر بری نظر تھی۔ ماجھا جیل چلا گیا اور سراج دین بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ شاداں کی ماں صفیہ بی بی کی آنکھیں بے نور تھیں۔ مطلب یہ کہ شاداں کی عزت کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا لہٰذا اس نے...... گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ شاداں کے اس عمل نے چودھری انعام کی بے غیرتی بردار ضد کو ہوا دی اور اس نے شاداں کو اٹھوانے کا منصوبہ بنا لیا۔ اس رات جو ڈاکو شاداں کے گھر پر حملہ آور ہوئے وہ چودھری انعام کے بھیجے ہوئے بندے تھے۔ نابینا صفیہ نے اپنی بیٹی کو بچانے کی جو لولی لنگڑی کوشش کی، اس کے نتیجے میں وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔ شاداں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ماں کو موت کے منہ میں جاتے دیکھ لیا تھا اسی لیے اس نے فرار ہونے کے لیے چھت کی راہ لی تھی۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگ اسے کسی بھی قیمت پر چھوڑیں گے نہیں لہٰذا جب اسے اپنے بچاؤ کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا تو اس نے جان گنوا کر اپنی عزت بچالی۔ وہ معصوم لڑکی چودھری انعام کے جبر کی بھینٹ چڑھ گئی تھی......''

بات کے اختتام پر خادم حسین اداسی بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''مطلب یہ کہ...... ہمہ خانہ کمین است!''

وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

''خادم حسین!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جب تمہیں چودھری خاندان کے کالے کرتوتوں کی جان کاری ہے تو میں مان نہیں سکتا کہ سابق تھانہ انچارج ان ترش حقائق سے آگاہ نہ ہو......''

''فیض صاحب یہ ساری باتیں جانتے تھے۔'' حوالدار نے کہا۔

''پھر انہوں نے چودھری فیروز اور اس کے خچر الانچار فرزند صغیر چودھری انعام کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کی؟'' میں نے خفگی آمیز لہجے میں استفسار کیا۔

''میں سمجھتا ہوں اس کے دو اسباب تھے۔'' اس نے

جواب دیا۔ ''ایک تو ان ساری باتوں کا پتا شاداں کی موت کے کافی عرصے بعد چلا تھا اور دوسرے......!''

خادم حسین ہچکچاہٹ بھرے انداز میں بولتے بولتے رکا تو میں نے پاٹ دار آواز میں دریافت کیا۔ ''دوسرا سبب کیا تھا؟''

''میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ فیض صاحب اپنے دل میں چودھری فیروز کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔'' حوالدار نے بتایا۔ ''وہ اکثر چودھری صاحب سے ملنے حویلی بھی جایا کرتے تھے......!''

''میں سمجھ گیا خادم حسین......!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جب قانون کے محافظ مجرموں کے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کا کام سنبھال لیں تو پھر معاشرے میں اسی نوعیت کے ظالمانہ واقعات رونما ہونے لگتے ہیں لیکن میں فیض محمد نہیں، ملک صفدر حیات ہوں۔ مجرموں کے لیے میرے دل و دماغ میں رتی بھر بھی گنجائش نہیں ہے۔ میری بات سمجھ میں آرہی ہے نا......؟''

''چنگی طراں سمجھ گیا ملک صاحب......!'' وہ بڑے عزم سے بولا۔ ''اس نیک کام میں آپ قدم قدم پر مجھے اپنے ساتھ پائیں گے۔''

''دیکھو خادم حسین!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''جو گزر گیا، سو گزر گیا۔ آئندہ کے لیے ہمیں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا ہوں گے۔ پچھلی رات چودھری فیروز کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے اس کی تفتیش کے دوران میں بہت ساری ایسی نئی چیزیں کھل کر سامنے آئیں گی جن کے ڈانڈے ماضی سے جا کر ملتے ہوں گے لہٰذا ہمیں گڑے مردے اکھاڑنے کا بھی خاطر خواہ موقع ملے گا۔ اگر ماجھا کے حوالے سے چودھری فیروز کا شک درست ہے تو پھر یہ بھی طے ہے کہ ماجھا کو جیل میں سراج دین، صفیہ اور شاداں کی المناک اموات کی خبریں ملی ہوں گی۔ اسی لیے اس نے چودھری فیروز کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا ہے۔ اس نے چودھری کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا بلکہ نمونۂ عبرت بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ میری نظر میں ماجھا کا اگلا شکار چودھری انعام ہوسکتا ہے...... تمہارا کیا خیال ہے خادم حسین؟''

''میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں ملک صاحب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس سنگین حقیقت کا اندازہ چودھری فیروز کو بھی ہوگا۔''

''چودھری فیروز کے اندازوں کی ہمیں فکر نہیں کرنا چاہیے۔'' میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''وہ جو سوچتا ہے، سوچتا رہے۔ ہمیں پہلی فرصت میں اس بندے کو گرفت میں لینا ہے جو گزشتہ رات ڈاکو کے بھیس میں ایک قصاب کا کردار ادا کرتے ہوئے چودھری فیروز کی بائیں ٹانگ کاٹ کر اپنے ساتھ لے گیا ہے اور اگر......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اور اگر...... اس بہیمانہ کارروائی میں ماجھا ہی ملوث ہے تو ہمیں جلد از جلد اس کے مخبر کا سراغ لگانا ہوگا۔ اگر وہ نامعلوم خبری ہمارے ہاتھ لگ گیا تو پھر ماجھا کو چھاپنا بہت آسان ہوجائے گا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' خادم حسین نے گردن کو تائیدی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''کل صبح چودھری فیروز اسپتال سے حویلی آجائے گا اور چودھری انعام اپنے باپ کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا ہے۔ اگر ہم دو سادہ لباس اہلکاروں کو حویلی کی خفیہ نگرانی پر مامور کردیں تو ہمیں اہم معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔''

''اچھا آئیڈیا ہے......'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''تم کل صبح ہی دو ہوشیار قسم کے سادہ لباس پولیس اہلکاروں کو ضروری ہدایات کے ساتھ ظفر گڑھ روانہ کردینا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

''میں ماجھا کیس کے حوالے سے اہم کاغذات کو آج اپنے ساتھ کوارٹر پر لے جاؤں گا تاکہ رات میں باریک بینی اور توجہ کے ساتھ میں ان کا مطالعہ کرسکوں۔ ہوسکتا ہے دو سال پرانے اس کیس کی فائل میں مجھے کام کی کوئی چیز مل جائے......!''

''آپ نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے ملک صاحب!'' خادم حسین نے عقیدت بھرے انداز میں کہا۔

اس رات میں کافی دیر تک نیاز مرڈر کیس والی فائل کے ساتھ سر کھپاتا رہا لیکن مجھے کہیں بھی کوئی ایسا پوائنٹ نہیں ملا جو ماجھا کی موافقت اور چودھری فیروز کی مخالفت میں جاتا ہو۔ یہ رپورٹ چونکہ سابق تھانہ انچارج فیض محمد نے تیار کی تھی لہٰذا یہی ہونا تھا جو نظر آرہا تھا۔ فیض صاحب تو چودھری فیروز کے ہم جلیس ہونے کا اعزاز رکھتے تھے پھر وہ چودھری اور اس کے خاندان کے کسی فرد کے خلاف کوئی تہدیدی یا تعزیری کارروائی کیسے کرسکتے تھے......!

ان زہر آلود خیالات نے میری طبیعت مکدر کردی۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھنے والا کوئی ذمے دار شخص

جب انتہائی غیر ذمے داری کا مظاہرہ کرتا ہے تو بہ الفاظِ دیگر وہ ڈیپارٹمنٹ کے منہ پر طمانچہ رسید کر رہا ہوتا ہے کیونکہ اس کے ایسے عمل سے قانون ٹھٹول بن کر رہ جاتا ہے......!

ابتدا میں میرے ذہن میں چودھری فیروز کی شخصیت کے حوالے سے جو صحت مند اور مثبت تصور قائم ہوا تھا، تلخ حقائق آشکار ہونے کے بعد وہ کرچی کرچی ہو کر میری یادداشت میں بکھر گیا تھا۔ ان تکلیف دہ لمحات میں خود کو نیند کی دیوی کے حوالے کرنے سے پہلے میں نے یہ ارادہ باندھا کہ کل کسی وقت میں ماجھا کی محبوبہ سے ایک تفصیلی ملاقات ضرور کروں گا۔

مجھے امید تھی کہ تاجی میرے لیے کافی کارآمد ثابت ہوگی۔

☆☆☆

اکیس جنوری کی صبح بڑی سنسنی خیز اور ہنگامہ پرور ثابت ہوئی۔ میں حسبِ معمول نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد ناشتے کی تیاری کر رہا تھا کہ میرے کوارٹر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس خلافِ توقع دستک نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو سامنے کانسٹیبل رئیس کو کھڑے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''کیا بات ہے رئیس......؟'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ ''تم اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

''ادھر نصیر آباد میں بھی ظفر گڑھ جیسی ایک واردات ہوگئی ہے۔'' کانسٹیبل نے اضطراری لہجے میں بتایا۔ ''وہاں سے دو بندے اطلاع دینے آئے ہیں اور بار بار منت کر رہے ہیں کہ ہمیں جلد از جلد وہاں پہنچنا چاہیے......''

موضع نصیر آباد میرے تھانے سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع تھا۔ میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔

''کیا ڈاکو نصیر آباد کے کسی وسنیک کی ٹانگ کاٹ کر لے گئے ہیں؟''

یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ کانسٹیبل رئیس کے بیان کے مطابق نصیر آباد میں بھی ظفر گڑھ جیسی ایک واردات ہوئی تھی۔ میرے استفسار کے جواب میں کانسٹیبل نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔

''نہیں جناب...... اس بار ڈاکو پٹواری امیر بخش کا ایک ہاتھ کاٹ کر لے گئے ہیں۔ پٹواری کا چھوٹا بھائی کریم بخش ایک بندے کے ساتھ تھانے میں بیٹھا ہے اور مسلسل یہی اصرار کر رہا ہے کہ پولیس کو فوراً کوئی ایکشن لینا چاہیے، اسی لیے میں آپ کو ڈسٹرب کرنے آگیا ہوں......''

''ٹھیک ہے، تم جاؤ اور نصیر آباد جانے کے لیے کسی تانگے کا بندوبست کرو۔'' میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ ''میں تیار ہو کر آرہا ہوں۔''

رئیس کے جانے کے بعد میں نے یونیفارم پہننے کے دوران میں ہی جلدی جلدی واجبی سا ناشتا کیا اور تیار ہو کر تھانے آگیا۔ حوالدار خادم حسین نے میرے کمرے میں آکر مجھے سلام کیا اور گمبھیر لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! ہمارا خیال تھا کہ ڈاکوؤں کا اگلا شکار چودھری انعام ہوگا لیکن پٹواری امیر بخش نشانہ بن گیا۔''

''کیا پٹواری کا ماجھا کے معاملات سے کچھ لینا دینا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی بالکل ہے!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ پٹواری امیر بخش اور چودھری فیروز میں بڑی گہری دوستی ہے۔ سراج دین کی پانچ ایکڑ زرعی اراضی چودھری نے اسی پٹواری کی مدد سے اپنے نام کرائی تھی۔''

''ہوں......!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرا یہ شک رفتہ رفتہ یقین میں بدلتا جا رہا ہے کہ ان واقعات کے پیچھے ماجھا ہی کا ہاتھ ہے......'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے حوالدار سے پوچھا۔ ''خادم حسین! کیا تم نے دو سادہ لباس اہلکاروں کو ظفر گڑھ کی جانب روانہ کر دیا ہے؟''

''جی ملک صاحب!'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''کانسٹیبل مختار احمد اور فضل محمود آپ کی آمد سے چند منٹ پہلے ہی تھانے سے گئے ہیں۔ میں نے انہیں ان کا کام اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ''پٹواری والے واقعے کے بعد چودھری انعام کے لیے حالات اور بھی خطرناک ہوگئے ہیں۔ میں نصیر آباد سے ہو کر آتا ہوں۔ اس دوران میں تھانے کے معاملات کو تم نے سنبھالنا ہے۔''

''آپ بے فکر ہو کر جائیں ملک صاحب۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کو کسی بھی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

اسی وقت کانسٹیبل رئیس نے میرے پاس آکر بتایا۔

''ملک صاحب! میں نے آپ کے لیے تانگے کا انتظام کر دیا ہے اور اطلاع کنندگان کو تانگے میں بٹھا بھی دیا ہے۔''

''اب تم بھی جا کر تانگے پر سوار ہو جاؤ۔'' میں نے

سرسری انداز میں کہا۔ ''تم میرے ساتھ نصیر آباد جاؤ گے۔''

''جو حکم ملک صاحب......'' یہ کہتے ہوئے کانسٹیبل کمرے سے نکل گیا۔

جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا موضع نصیر آباد میرے تھانے سے محض ڈیڑھ میل کی دوری پر جنوب مغرب میں واقع تھا۔ یہ مختصر سا فاصلہ طے کرنے میں ہمیں چند منٹ لگے ہوں گے تاہم ٹھنڈی ٹھار کھلی فضا میں سفر کرتے ہوئے ہمیں لگ پتا گیا تھا۔ راستے بھر پٹواری کے بھائی سے بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رہا تھا۔ کریم بخش ہی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ پٹواری کو ابھی کسی اسپتال نہیں لے جایا گیا تاہم اس کے کٹے ہوئے ہاتھ پر کس کر پٹی باندھ دی گئی تھی جس سے خون کے بہاؤ میں تو کمی واقع ہوئی تھی مگر خون کا رساؤ جاری تھا۔ میرے نزدیک پٹواری کے گھر والوں نے عقل مندی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ فوری طور پر پٹواری کو اسپتال پہنچانا ناگزیر تھا۔

موضع نصیر آباد لگ بھگ سو گھروں کی آبادی کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں بسنے والے افراد کی تعداد تین سے چار سو کے درمیان رہی ہوگی۔ تانگا پٹواری امیر بخش کے گھر کے سامنے رکا اور مجھے فی الفور اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں اس وقت پٹواری ایک گرم بستر پر لیٹا ہائے ہائے کر رہا تھا۔

میں پٹواری والے پلنگ کے نزدیک ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور پٹی بندھے ہاتھ کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ پٹواری کے دائیں ہاتھ کو کلائی کے مقام سے کاٹا گیا تھا اور یہ دلخراش کارروائی کرنے والے اس کا کٹا ہوا دایاں ہاتھ ساتھ لے گئے تھے۔ یہ بڑی حد تک چودھری فیروز والے واقعے سے ملتی جلتی واردات تھی۔

پٹواری امیر بخش کی عمر پچپن سال تھی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی لہٰذا اس کے ساتھ بیوی بچوں والا کوئی معاملہ نہیں تھا جبکہ اس سے پانچ سال چھوٹا بھائی کریم بخش شادی شدہ تھا۔ اس کی اولادوں میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ کریم بخش کی بیوی جمیلہ ایک سگھڑ گھریلو عورت تھی۔ دونوں بھائی ایک ہی گھر میں راضی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے کہ گزشتہ رات والے واقعے نے ان کے سکون اور خوشی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔

پٹواری امیر بخش کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں اس سے کوئی لمبی چوڑی پوچھ تاچھ کرتا تاہم چند سوالات کرنا ضروری تھے۔ میرے استفسار پر اس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے جو کہانی سنائی وہ چودھری فیروز والے واقعے کی بازگشت لگتی تھی۔ ڈھاٹا پوش تین مسلح ڈاکو...... بُغدا اور مُڈی...... تکیے کا ڈوری والا غلاف...... ظالمانہ کارروائی اور ...... یہ جا، وہ جا......!

''آپ کو کسی پر شک ہے؟'' میں نے پٹواری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تھانے دار صاحب...... شک نہیں یقین ہے۔'' وہ درد کی شدت سے کراہتے ہوئے بولا۔ ''یہ اسی نامراد ماجھا کا کام ہے جس نے کل رات چودھری صاحب کی ٹانگ کاٹی تھی۔''

''ماجھا کی آپ سے ایسی کیا دشمنی ہے؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''وہ خوامخواہ ہی میرا دشمن بن گیا ہے......'' وہ اذیت بھری آواز میں بولا۔ ''حالانکہ میں نے کبھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ ماجھا کا باپ چودھری صاحب کا مقروض تھا اور قرض لیتے وقت سراج دین نے اپنی پانچ ایکڑ زمین کے کاغذات چودھری صاحب کے پاس رکھوائے تھے۔ ایسی ضمانت کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اگر قرض دار قرض کی رقم واپس نہ کر سکے تو قرض خواہ اس کی گروی رکھی ہوئی چیز کا مالک بن جاتا ہے۔ میں نے تو صرف قانونی کارروائی میں چودھری صاحب کی مدد کی تھی۔ اس میں میرا کیا قصور تھانے دار صاحب......؟''

مجھے ان سوالوں کا جواب بھی مل گیا تھا جو میں نے پٹواری سے پوچھے بھی نہیں تھے۔ لہٰذا میں نے فوری طور پر گھائل پٹواری کو کانسٹیبل رئیس کی نگرانی میں ضروری علاج معالجے کے لیے اسپتال روانہ کر دیا اور خود کریم بخش کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

کریم بخش نصف صدی کا سفر طے کر چکا تھا۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک فربہ شخص تھا۔ اس کے پاس بیس ایکڑ زرعی اراضی تھی۔ زراعت کے تمام معاملات میں اس کے دونوں بیٹے منظور اور سعید بھی اس کی مدد کرتے تھے۔ منظور کی عمر بیس سال تھی جبکہ سعید اٹھارہ سال کا تھا۔ آسیہ اور مریم اپنے بھائیوں سے چھوٹی تھیں جن کی عمریں علی الترتیب پندرہ اور دس سال تھیں۔ منظور اپنے زخمی تایا پٹواری امیر بخش کے ساتھ اسپتال چلا گیا تھا جبکہ سعید میرے پاس موجود تھا۔

''کیا پٹواری کے ساتھ یہ حادثہ اسی کمرے میں پیش آیا ہے؟'' میں نے سوال کرنے کے بعد باری باری باپ بیٹے کی طرف دیکھا۔

''نہیں جناب......'' سعید نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''تایا ابو اپنے کمرے میں سو رہے تھے جب یہ واقعہ پیش آیا۔ بعد میں ہم انہیں اٹھا کر یہاں لے آئے تھے تاکہ ان کے زخمی ہاتھ کی مرہم پٹی کر سکیں۔''

کریم بخش نے بتایا۔ ''ہم دونوں بھائی اگرچہ ایک ہی چار دیواری کے اندر رہائش پذیر ہیں اور کھانا پینا بھی ایک ساتھ ہی ہے لیکن امیر بھائی نے اپنے آرام کے لیے ایک الگ تھلگ کمرا مخصوص کر رکھا ہے۔ ان کا سارا سامان، کپڑا لتا، کاغذات وغیرہ...... سب کچھ اسی کمرے میں رکھا ہوا ہے۔ اس وقت آپ جہاں بیٹھے ہوئے ہیں، گھر کا یہ حصہ ہمارے استعمال میں ہے۔''

''میں اس الگ تھلگ کمرے کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں جہاں پچھلی رات پٹواری صاحب سو رہے تھے۔'' میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ مجھے وہاں لے جا سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں جناب...... آپ آئیں میرے ساتھ۔'' کریم بخش بھی میری تقلید میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ مکان لگ بھگ دس مرلہ زمین پر تعمیر کیا گیا تھا۔ کراچی والے اس مکان کے رقبے کو کم و بیش تین سو گز سمجھ لیں۔ کریم بخش فیملی والا تھا اور اس کے فیملی ممبرز کی تعداد چھ تھی لہٰذا مکان کے بیشتر حصے پر انہی لوگوں کا قبضہ تھا۔ پٹواری امیر بخش کے تصرف میں صرف ایک کمرا ہی تھا اور مذکورہ کمرا گھر کے داخلی دروازے کی ایک جانب بنا ہوا تھا اور دوسری طرف بیٹھک تھی۔ بیٹھک کی طرح پٹواری والے کمرے میں داخلے کے لیے ایک دروازہ باہر کی سمت بھی تھا۔ میں کریم بخش کے ہمراہ گھر کے اندرونی حصے سے چلتے ہوئے اس کمرے تک پہنچا تھا لہٰذا مذکورہ کمرے میں داخل ہونے کے لیے ہم نے اندرونی دروازہ استعمال کیا تھا۔

وہ ایک کشادہ کمرا تھا جس میں انسانوں کی آمد و شد کے لیے دو دروازے تھے اور روشنی و ہوا کے گزر کے لیے ایک کھڑکی موجود تھی جیسا کہ متاثرہ چودھری فیروز کی وہ خواب گاہ تھی جہاں مبینہ طور پر ڈاکوؤں نے اسے بائیں ٹانگ سے محروم کر دیا تھا جبکہ یہاں پر پٹواری کی دائیں کلائی کو ہاتھ کے وجود سے بے نیاز کر دیا گیا تھا۔ یہ خاصا عجیب مگر دلچسپ اتفاق تھا۔ ایک اور قدر مشترک یہ بھی تھی کہ دونوں کے کمرے کے آگے کشادہ صحن تھا یعنی چودھری کی خواب گاہ کے سامنے اور پٹواری کی خواب گاہ کے پہلو میں......!

پٹواری امیر بخش کے کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ پلنگ بچھا ہوا تھا جس پر گرم بستر بھی نظر آ رہا تھا تاہم مذکورہ بستر پر مجھے کہیں بھی خون کے دھبے دکھائی نہیں دیے البتہ کمرے کے فرش پر چوبی مڈی موجود تھی جس کے نزدیک دور دور تک خون پھیلا ہوا تھا۔ میں خون آلود فرش کا معائنہ کر رہا تھا کہ کریم بخش نے دکھ بھرے لہجے میں مجھے بتایا۔

''وہ ظالم لوگ امیر بھائی کا ہاتھ کاٹنے کے بعد انہیں ادھر ٹھنڈے فرش پر ہی تڑپتا ہوا چھوڑ گئے تھے۔ جب ہم نے یہاں آ کر دیکھا تو ان کا چہرہ تکیے کے غلاف میں چھپا ہوا تھا اور وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا رہے تھے۔ پھر ہم انہیں اٹھا کر گھر کے دوسرے حصے میں لے گئے تھے۔''

کریم بخش اپنی بات مکمل کر چکا تو میں سوچنے لگا حملہ آور ڈاکوؤں کو گدھے گھوڑے کی خوب پہچان تھی۔ پٹواری کا آپریشن کرنے کے بعد وہ اسے ''مذبح'' پر ہی پھینک گئے تھے جبکہ چودھری کی ''سرجری'' کے بعد وہ اسے گرم بستر پر لٹا گئے تھے۔

مجھے کمرے میں ایک ناگواری بو کا احساس ہو رہا تھا۔ جب سے میں اس کمرے میں داخل ہوا تھا، یہ بو مسلسل میرے نتھنوں پر دستک دے رہی تھی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ فرش پر پھیلے ہوئے خون کی بو ہے لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ محض بو ہی نہیں بلکہ بدبو ہے...... ایک مخصوص بساند!

میں اس وقت اکڑوں بیٹھ کر فرش کا معائنہ کر رہا تھا۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ اگلے ہی لمحے اس بساند کا ماخذ مجھے نظر آ گیا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پٹواری کے پلنگ کے نیچے ایک، گھٹنے سے کٹی ہوئی ٹانگ پڑی تھی۔ اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ادھوری ٹانگ ظفر گڑھ کے مطلق العنان چودھری فیروز کے بدن کا ہی حصہ تھی......!

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کریم بخش کی طرف دیکھ کر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اس پلنگ کو ہٹانے میں میری مدد کرو۔''

مذکورہ پلنگ خاصا وزنی تھا ورنہ میں اکیلا ہی اسے گھسیٹ لیتا۔ کریم بخش کوئی سوال کیے بغیر میرے حکم کی تعمیل میں لگ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم دونوں نے پلنگ کو اٹھا کر دوسری جگہ پر رکھ دیا۔ اگلے ہی لمحے کریم بخش کے حلق سے ایک حیرت بھری آواز خارج ہوئی۔

''تھانے دار صاحب...... یہ کیا ہے......؟''

''یہ تمہارے بھائی امیر بخش کے عزیز از جان دوست چودھری فیروز کی ٹانگ کا ایک حصہ ہے جو پچھلی

رات ڈاکوؤں نے حویلی میں کاٹی تھی۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کریم بخش کو بتایا۔ ''اب آپ خود اندازہ لگا لو کہ آپ کے بھائی کا کٹا ہوا ہاتھ کہاں پایا جائے گا؟''

وہ بے ساختہ بولا۔ ''جہاں ماجھا تیسری کارروائی کرے گا۔''

''بالکل درست!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ ایک ذہین انسان ہیں۔ اب جلدی سے کوئی ایسا تھیلا یا بوری لے آؤ جس میں اس کٹی ہوئی بساندی ٹانگ کو بند کیا جاسکے۔''

''جی ٹھیک ہے......'' یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گیا۔

میں نے گزشتہ روز اسپتال میں چودھری فیروز سے تفصیلی ملاقات کی تھی اس لیے میں اس ٹانگ کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کیونکہ چودھری کو لباس تبدیل کیے بغیر ایمرجنسی میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ اس ادھوری بے جان ٹانگ پر وہی لباس موجود تھا جو چودھری نے زیب تن کر رکھا تھا۔

دو منٹ سے پہلے کریم بخش لوٹ آیا۔ سعید بھی اس کے ساتھ تھا۔ کریم بخش کے ہاتھ میں مجھے کھاد والی خالی بوری نظر آئی تو میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور کہا۔

''کریم بخش......! یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ کھاد والی خالی بوری اٹھا لائے۔ کٹی ہوئی ٹانگ کی بساند کھاد کی مخصوص بو میں نفوذ ہو کر اپنا وجود کھو دے گی۔ اب تم لوگ جلدی سے اس ادھوری ٹانگ کو کھاد والی بوری میں قید کر کے بوری کے منہ کو اچھی طرح بند کر دو۔''

آئندہ دس منٹ میں ان باپ بیٹے نے میری ہدایت کے مطابق چودھری فیروز کی کٹی ہوئی ٹانگ کو ''پیک'' کر کے گھر کے صحن میں ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے بعد کریم بخش کا بیٹا سعید وہاں سے چلا گیا۔ میں دوبارہ پٹواری کے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

''اس الماری میں کیا ہے؟'' میں نے ایک دیوار کے ساتھ استادہ چوبی الماری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''امیر بھائی اس الماری میں اپنے ضروری کاغذات رکھتے ہیں جیسا کہ مختلف فائلیں اور دیگر دستاویزات......'' اس نے بتایا۔ ''اس کی چابی بھائی صاحب کے پاس ہی ہوتی ہے اس لیے میں الماری کو کھول کر آپ کو نہیں دکھا سکتا۔''

''اس کی ضرورت نہیں کریم بخش! مجھے آپ کی بات پر بھروسا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ کے بھائی کوئی معمولی انسان نہیں ہیں۔ وہ ایک پٹواری ہیں۔ زمین و جائداد کے کاغذات سے ان کا صبح شام کا واسطہ ہے۔ میں ان کے کام کو سمجھ سکتا ہوں۔''

''تھانے دار صاحب!'' وہ تملق آمیز لہجے میں بولا۔ ''اگر آپ ہم لوگوں پر ایک مہربانی کر دیں تو ہم آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھیں گے......'' بات کے اختتام پر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے تھے۔

مجھے اس کی حالت پر بہت ترس آیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے بے پناہ کرب جھلکتا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کریم بخش! اس انداز میں خوشامد کی ضرورت نہیں۔ صاف صاف بتائیں، آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ اگر قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے میرے لیے ممکن ہوا تو ضرور کروں گا۔''

''ماجھا کی اصل دشمنی چودھری فیروز سے ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''چودھری کا امیر بھائی سے بہت میل ملاپ ہے اسی لیے وہ بھائی کے خلاف ہو گیا ہے۔ آپ ماجھا کی اس مخالفت کو بغض لِلّٰہی سمجھ لیں......!''

''ہوں......'' میں نے گہری نظر سے کریم بخش کی طرف دیکھا اور ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ''ماجھا کی چودھری فیروز سے کیا دشمنی ہے؟''

''دیکھیں جی، میں اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک سیدھا سادہ زمیندار ہوں اس لیے خوامخواہ کے معاملات میں نہیں پڑتا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن امیر بھائی کا کام ایسا ہے کہ انہیں ہر قسم کے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے جس میں اچھے بُرے بھی شامل ہیں۔ ان سے تو گھر پر ملاقات کرنے بھی کئی افراد آتے ہیں۔ یہ کرسیاں انہوں نے اپنے ملاقاتیوں کے لیے ہی رکھی ہوئی ہیں......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ لگی چار کرسیوں کی جانب اشارہ کر دیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی مذکورہ کرسیوں پر میری نگاہ پڑی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ کریم بخش سے اس بارے میں استفسار کروں گا لیکن ادھوری ٹانگ کی ''بازیابی'' نے میری تمام تر توجہ اپنی جانب مبذول کر لی تھی اور میں کریم بخش سے پوچھنا بھول گیا تھا۔

کریم بخش کے نامکمل جواب پر میں نے کہا۔ ''آپ نے مجھے ماجھا اور چودھری فیروز کی دشمنی کے بارے میں نہیں بتایا؟''

''میں اسی طرف آرہا تھا۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''لیکن آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ چودھری کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے......!''

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ چودھری کے غیظ و غضب سے حد درجہ خوفزدہ تھا مگر اپنے پٹواری بھائی کی پوزیشن صاف کرنے کا بھی متمنی تھا اسی لیے وہ بے محابا کچھ کہنے سے ہچکچا رہا تھا۔

''کریم بخش!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ ''اگر تم نے مجھے سب کچھ سچ سچ بتادیا تو سمجھو، یہ معاملہ یہیں پر ختم ہوجائے گا۔ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو اس گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں جائے گی لیکن ابھی یا بعد میں کبھی یہ پتا چلا کہ آپ نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی تو پھر مجھ سے کسی رو رعایت کی توقع نہیں رکھنا۔ چودھری فیروز تو ہوسکتا ہے امیر بخش کی دوستی کے طفیل آپ کو معاف کردے مگر قانون کو گمراہ کرنے کے جرم میں، میں آپ کا وہ حشر کروں گا جس کا آپ تصور بھی نہیں کرسکتے......!''

''اگر میں آپ سے کچھ بھی غلط کہوں تو میرا جھوٹ میری اولاد کے لیے قہر بن جائے۔'' وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ''اس سے زیادہ میں آپ کو کوئی گارنٹی نہیں دے سکتا......!''

میں نے بغور کریم بخش کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور مجھے وہاں کسی قسم کی روباہی کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''شروع ہوجائیں۔ میں سن رہا ہوں۔''

آئندہ پندرہ بیس منٹ میں کریم بخش نے مجھے ظفر گڑھ، وہاں کے چودھری خاندان اور ماجھا اینڈ کمپنی کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ حوالدار خادم حسین کی فراہم کردہ معلومات سے میل کھاتا تھا۔ اس سے مجھے دو باتوں کا یقین ہوگیا۔ اول، خادم حسین میرے ساتھ بہ الفاظِ دیگر قانون کے ساتھ صد فیصد مخلص تھا۔ دوم، چودھری فیروز اور اس کا فرزند صغیر چودھری انعام رذیلِ درجۂ اول تھے۔ انہیں کسی بھی طرح کی تعویق دینا ایک سنگین غلطی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ایسے طامع اور سفاک افراد کی سرکوبی مجھ پر واجب ہوگئی تھی۔ قبل اس کے کہ ان کی کوئی نئی رذالت میری سماعت تک رسائی حاصل کرپاتی، مجھے کوئی ہنگامی قدم اٹھانا تھا۔

کریم بخش خاموش ہوا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا آپ نے کبھی اپنے بھائی امیر بخش کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ چودھری فیروز جیسے گرگِ گرسنہ افراد سے دور رہیں کیونکہ اس قماش کے لوگوں کی گرسنگی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ یہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں...... چھڈ بُرے دی یاری......!''

''امیر بھائی مجھ سے بڑے ہیں اور پڑھے لکھے بھی ہیں۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''میری بات کا ان پر اثر نہیں ہوتا اور میں زیادہ زور بھی نہیں دے سکتا۔ وہ بہت جلد غصے میں آجاتے ہیں، پھر وہ کسی کی نہیں سنتے۔ وہ ہمیشہ سے اپنی مرضی کے مالک رہے ہیں۔ جب ہمارے ماں باپ زندہ تھے تو انہوں نے بڑی کوشش کی کہ امیر بھائی شادی کرلیں لیکن یہ کسی طرح تیار نہ ہوئے۔ اگر انہوں نے ٹھیک وقت پر شادی کرلی ہوتی تو آج ان کے بھی بچے ہوتے۔ وہ یوں تنہائی کی زندگی نہ گزار رہے ہوتے۔ خیر......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے خواب ناک لہجے میں بولا۔

''جو سوہنے رب کی مرضی......!''

''کریم بخش......!'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جلد ہی امیر بخش کو راہِ راست پر لانے کا کوئی راستہ نکال لوں گا اور ہاں...... ہمارے بیچ ابھی جو بات چیت ہوئی ہے، اسے بھول جانا۔''

اس وقت ہم دونوں کے سوا پٹواری کے کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور بڑی فرماں برداری سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''جی تھانے دار صاحب...... آپ کا جو حکم!''

اچانک میری نظر پٹواری کے کمرے کے اس دروازے پر پڑی جو باہر گلی میں کھلتا تھا۔ اس وقت مذکورہ دروازے پر اندر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے انگلی سے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کریم بخش سے پوچھا۔

''کیا امیر بخش گھر میں آمد و رفت کے لیے یہی دروازہ استعمال کرتا ہے؟''

''نہیں جناب! یہ دروازہ صرف ان کے ملاقاتیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔'' کریم بخش نے بتایا۔ ''بھائی گھر میں داخلے کے دروازے ہی سے آتے جاتے ہیں جیسا کہ ہم سب کرتے ہیں۔ پھر گھر سے اپنے کمرے میں جانے کے لیے وہ یہ دروازہ استعمال کرتے ہیں۔'' اس نے کمرے کے پہلو والے گھر کی سمت کھلنے والے دروازے کی طرف

اشارہ کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بتایا۔ ''جب کوئی بندہ اپنے کسی کام سے بھائی کے پاس آتا ہے تو وہ اس کے لیے بیرونی دروازہ کھولتے ہیں تاکہ گھر میں پردے کے معاملات متاثر نہ ہوں۔''

''آج کس وقت آپ لوگوں کو پتا چلا کہ امیر بخش کے ساتھ کوئی اذیت ناک حادثہ پیش آچکا ہے؟'' میں نے کریم بخش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''اس وقت فجر کی اذانیں ہورہی تھیں۔'' اس نے روہانسی آواز میں بتایا۔ ''امیر بھائی کی چیخوں کی آواز سب سے پہلے میں نے ہی سنی تھی بلکہ یوں سمجھیں کہ میری آنکھ اسی دردناک آواز سے کھلی تھی۔ میں نے فوراً منظور اور سعید کو جگایا پھر ہم تینوں امیر بھائی کے کمرے میں پہنچ گئے اور ہم نے دیکھا امیر بھائی فرش پر پڑے بری طرح تڑپ رہے تھے۔ انہوں نے بائیں ہاتھ سے اپنی دائیں کلائی کو پکڑ رکھا تھا اور اس کلائی پر ہاتھ کہیں نظر نہیں آرہا تھا بلکہ کلائی کے مقام سے خون نکل کر کمرے کے فرش پر پھیل رہا تھا۔ ہم گھائل امیر بھائی کو اٹھا کر گھر کے دوسرے حصے میں لے گئے اور خوب کس کر ان کی زخمی کلائی پر پٹی باندھ دی......''

اس نے توقف کر کے ایک جھرجھری لی پھر میری طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''اس کے بعد ہی میں نے آپ کو اطلاع دینے کے لیے تھانے کا رخ کیا تھا۔ باقی کے حالات آپ کے سامنے ہیں......''

''کریم بخش! اچھی طرح سوچ سمجھ کر میرے آخری سوال کا جواب دیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''جب آپ باپ بیٹے امیر بخش کی چیخیں سن کر اس کمرے میں پہنچے تو کمرے کا گلی کی طرف کا دروازہ بند تھا یا کھلا ہوا تھا......؟''

''اس دروازے کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔'' وہ متذکرہ بالا دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے اضطراری لہجے میں بولا۔ ''میں نے ہی اس دروازے کو بند کر کے کنڈی لگادی تھی۔''

حملہ آوروں کا کھیل میری سمجھ میں آگیا تھا۔ ان لوگوں میں کوئی ایسا شخص بھی شامل تھا جسے امیر بخش اچھی طرح جانتا تھا اور اسی نامعلوم شخص کی آواز پر پٹواری نے کمرے کا دروازہ کھولا ہوگا یا یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ان ڈاکوؤں میں سے کسی نے کمال ہوشیاری سے پٹواری کے کسی شناسا بندے کی آواز کی نقالی کر کے پٹواری سے دروازہ کھلوالیا ہو۔ اس معاملے کی حقیقت پٹواری کے تفصیلی انٹرویو کے بعد ہی کھل کر سامنے آسکتی تھی۔

میں نے نصیر آباد کو سردست خیرباد کہا اور چودھری فیروز کی ''پیک'' ٹانگ کو لے کر تھانے کی سمت روانہ ہوگیا۔ میرا ارادہ تو ظفر گڑھ جانے کا تھا لیکن تھانہ چونکہ راستے میں پڑتا تھا اس لیے میں نے حوالدار خادم حسین کو ٹچ کرنا ضروری سمجھا تھا کیونکہ اس کیس کے حوالے سے میرے ذہن میں جس منصوبہ بندی کا عمل جاری تھا اس کے بارے میں خادم حسین کو آگاہ کرنا ناگزیر تھا۔ میں نے جو کچھ سوچ لیا تھا، اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے مختلف مراحل پر مجھے خادم حسین کے پُرخلوص تعاون کی ضرورت تھی۔ لہٰذا اس کا اس منصوبے کی جزئیات سے واقف ہونا نہایت ہی اہم تھا۔

☆☆☆

ظفر گڑھ پہنچنے سے پہلے ہماری آمد کی اطلاع وہاں تک رسائی حاصل کرچکی تھی۔ چودھری اکرام نے اپنے حواریوں کے ساتھ حویلی کے داخلی گیٹ پر ہمارا استقبال کیا۔ رئیس، پٹواری امیر بخش کو اسپتال پہنچا کر واپس آگیا تھا۔ میں نے اسے ظفر گڑھ کے دورے کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اسی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ چودھری فیروز کو آج صبح ہی اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس وقت اپنی حویلی میں موجود ہوگا۔ میں نے کانسٹیبل کو ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے لیے کہا اور خود چودھری اکرام کی معیت میں چودھری فیروز کے پاس پہنچ گیا۔

چودھری فیروز اس وقت ایک آرام دہ گرم بستر پر گداز تکیوں سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ یہ وہ خواب گاہ نہیں تھی جہاں پر قصابی ڈاکوؤں نے اس کے تن سے ایک ٹانگ کو جدا کردیا تھا۔ میں چودھری کے بیڈ کے نزدیک ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''اب آپ کی ٹانگ کی تکلیف کیسی ہے؟''

''درد کافی کم ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''میں بہت ہمت والا ہوں ملک صاحب! اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گا۔ بس ذرا میری طبیعت ٹھیک ہوجائے پھر میں خود اس کمینے ماجھا کو ڈھونڈ کر کتے کی موت ماروں گا۔ حرامزادے نے مجھے زندگی بھر کے لیے بیساکھی کا محتاج بنادیا ہے۔ اگر وہ میری کٹی ہوئی ٹانگ کو ادھر ہی چھوڑ جاتا تو شاید ڈاکٹرز کسی آپریشن کے ذریعے میری ٹانگ کو جوڑ دیتے......!''

چودھری اکرام مجھے چودھری فیروز کے پاس چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس وقت میرے اور چودھری فیروز کے سوا اس کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے

چودھری کی بات مکمل ہونے پر کہا۔
"آپ کی گمشدہ ٹانگ کو میں نے تلاش کر لیا ہے مگر اس کی حالت ایسی نہیں کہ کسی معجزاتی جراحی کے بارے میں سوچا جا سکے۔ ویسے آپ کی ٹانگ کو گھٹنے کے مقام پر جس بے دردی سے کاٹا گیا تھا اس کو دیکھتے ہوئے کوئی ڈاکٹر وقوعہ کی رات بھی آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا!"
پتا نہیں چودھری نے میری بات پوری سنی بھی یا نہیں، میرے خاموش ہوتے ہی اس نے اضطرابی لہجے میں استفسار کیا۔ "آپ کو...... میری ٹانگ کہاں...... سے ملی...... وہ اس وقت...... کہاں ہے......؟"
اس کے سوالات کے جوابات دینے سے پہلے میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ "کیا آپ کو پٹواری امیر بخش کی کوئی خیر خبر ہے؟"
"نہیں تو......" وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ "کیا ہوا امیر بخش کو...... میں تو توقع کر رہا تھا کہ وہ ابھی مجھے دیکھنے آئے گا...... سب خیریت تو ہے نا......؟"
یہ بات تو صاف ہو گئی کہ پٹواری کو پیش آنے والے حادثے کی خبر ابھی تک ظفر گڑھ نہیں پہنچی تھی۔ میں نے چودھری فیروز کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔
"امیر بخش ابھی چند روز تک آپ کی خبر گیری کے لیے نہیں آسکے گا کیونکہ اسے خود تیمارداری کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ وہ اس وقت اسی اسپتال میں ہے جہاں سے آپ ڈسچارج ہوئے ہیں۔"
"کک...... کیا ماجھا نے...... امیر بخش کی ٹانگ بھی...... کاٹ ڈالی ہے......؟" وہ وحشت زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔
"نہیں۔ اس کا دایاں ہاتھ کلائی پر سے کاٹا گیا ہے۔" میں نے چودھری کی وحشت میں دہشت کے چار چاند لگاتے ہوئے بتایا۔ "میں نے آج صبح نصیر آباد جا کر اسے اسپتال بھیجا ہے۔ آپ کی کٹی ہوئی ٹانگ مجھے امیر بخش کے پلنگ کے نیچے پڑی ملی ہے۔ میں اسے ایک بوری میں بند کر کے ساتھ لے آیا ہوں۔ وہ بوری باہر تانگے میں رکھی ہوئی ہے......" لمحاتی توقف کر کے میں نے چاروں جانب متلاشی نگاہ دوڑائی پھر معنی خیز انداز میں استفسار کیا۔
"آپ کا چھوٹا بیٹا چودھری انعام مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ کیا وہ حویلی سے باہر گیا ہوا ہے؟"
میں نے حوالدار خادم حسین کے ساتھ مل کر جو ماسٹر پلان تیار کیا تھا...... اس پر عملدرآمدگی کا آغاز کر دیا تھا۔

چودھری نے حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میرے بات سنی پھر تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔
"ملک صاحب! آپ نے انعام کا کیوں پوچھا ہے۔ مجھے آپ کے انداز سے کافی ڈر محسوس ہو رہا ہے......!"
"یہ معاملہ ہے ہی ڈرنے والا چودھری صاحب!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر جان کھینچ نکالنے والے انداز میں کہا۔ "میرا مشورہ ہے کہ آپ چودھری انعام کو چند روز تک حویلی سے باہر نہ جانے دیں بلکہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھیں تو زیادہ اچھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حویلی کے اندر محافظوں کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیں۔ خاص طور پر رات میں کڑی پہرے داری کا معقول انصرام ہونا ضروری ہے......"
"یہ بھی...... تو بتائیں کہ...... معاملہ کیا ہے......؟" وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے سراسیمہ لہجے میں مستفسر ہوا۔
"جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے، ماجھا کا اگلا شکار چودھری انعام ہو سکتا ہے۔" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ نامراد انعام کے ساتھ کوئی بھی درندگی کر کے پٹواری کا کٹا ہوا دایاں ہاتھ گھائل انعام کے پاس چھوڑ کر نو دو گیارہ ہو جائے گا۔"
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ملک صاحب......" وہ حد درجہ پریشانی کے عالم میں بولا۔ "انعام نے اس شیطان کا کیا بگاڑا ہے؟"
قبل اس کے کہ میں چودھری فیروز کے سوال کا جواب دیتا، اکرام ایک ملازم صورت شخص کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ مذکورہ تنومند ملازم نے خوانِ ہفت نعمت اٹھا رکھا تھا۔ یہ سب میری خاطر داری کے لیے تھا۔ اکرام کی ہدایت پر جب ملازم نے وہ کنگ سائز ٹرے میرے نزدیک ہی ایک چوبی میز پر سجا دی تو چودھری فیروز نے اپنے بیٹے سے پوچھا۔
"اکرام...... انعام کہاں ہے؟"
"ابا جی! وہ باہر نکلا ہوا ہے۔" اکرام نے احترام بھرے لہجے میں جواب دیا۔
"وہ جہاں بھی ہے اسے ڈھونڈ کر فوراً میرے پاس بھیجو۔" چودھری نے اضطراری انداز میں کہا۔ "مجھے اس سے کوئی ضروری کام ہے۔"
"جی ابا جی......!" وہ فرمانبرداری سے بولا۔
اکرام اور ملازم کے جانے کے بعد چودھری نے مجھ سے

مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ملک صاحب! آپ کھانا پینا جاری رکھیں اور مجھے بتائیں کہ ماجھا کی انعام سے کیا دشمنی ہے؟''

''سچ کیا ہے، یہ تو آپ مجھے بتائیں گے چودھری صاحب! اور میں صرف آپ کی بات پر یقین کروں گا کیونکہ آپ میری نظر میں نہایت ہی معتبر اور محترم ہیں......'' میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس کی عقل پر پٹی باندھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن ماجھا کے دماغ میں آپ لوگوں کے خلاف جو زہر بھرا ہوا ہے وہ اسی کے مطابق اقدام کر رہا ہے......''

''اس بغلول کے بھیجے میں کون سا خناس سمایا ہوا ہے؟'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولا۔

میں نے کسی تکلف کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اللہ کی عظیم نعمتوں سے انصاف کا عمل جاری رکھا اور نہایت ہی مختصر الفاظ میں چودھری فیروز کو آئینہ دکھا دیا۔ میری بات سن کر چودھری کے چہرے پر زلزلے کے آثار پیدا ہوئے اور وہ غضب ناک لہجے میں بولا۔

''لگتا ہے اس احمق کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ وہ جیل سے فرار ہو کر خود کو کوئی سلطانہ ڈاکو یا ملنگی سمجھنے لگا ہے۔ میری نظر میں وہ ایک تھڑدلا اور کم ظرف انسان ہے جو یوں رات کی تاریکی میں چھپ کر سنگین وارداتیں کرتا پھر رہا ہے۔ یہ اس کی بسالت نہیں، گھٹیا پن ہے۔ ایک بار وہ میرے ہتھے چڑھ جائے تو میں اس کمی کمین کو ایسا پاٹ پڑھاؤں گا کہ اس کی آنے والی سات نسلیں آتے جاتے کو روک کر پوچھا کریں گی...... ہمارا ابا کون ہے؟''

''آپ اپنے حواس اور اعصاب کو قابو میں رکھیں چودھری صاحب!'' میں نے ہاتھ روکے بغیر اپنایت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ کا پُرسکون رہنا صحت کے لیے ناگزیر ہے۔ میں نے کہا نا، میں اسی بات پر یقین کروں گا جو آپ کے منہ سے نکلے گی۔ ماجھا کیا سوچتا پھر رہا ہے، اس کی مجھے بالکل پروا نہیں۔ آپ کو تو اس لیے بتا دیا کہ مخالف پارٹی کی ذہنیت آپ پر عیاں ہوجائے......''

یہ امکان میرے ذہن میں تھا کہ کہیں چودھری یہ نہ پوچھ بیٹھے کہ مجھے ماجھا کی منصوبہ بندی کا علم کیسے ہوا؟ لیکن خیریت گزری کہ اس نے ایسا کوئی سوال نہیں کیا۔ اپنی کٹی ہوئی ٹانگ، پٹواری کے ہاتھ کے عبرت ناک حشر اور مستقبل قریب میں چودھری انعام کے ساتھ ہونے والی کسی متوقع بہیمانہ کارروائی کے بھیانک تصور نے چودھری کی مت ماردی تھی۔ ان لمحات میں وہ مجھے اپنا سب سے زیادہ ہمدرد انسان سمجھ رہا تھا اور...... ان بے ایمان حالات میں مجھ ایسے اپنے خیرخواہوں سے ایسے سوالات نہیں کیے جاتے۔ ویسے اگر وہ اس پٹڑی پر آ بھی جاتا تو اسے ریڈ سگنل دینے کے لیے میرے پاس بہت کچھ تھا......!

''سچ کیا ہے، یہ میں آپ کو بتاتا ہوں ملک صاحب......!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''ماجھا کے باپ نے آج سے لگ بھگ پانچ سال پہلے مجھ سے کچھ رقم قرض لی تھی پھر وہ میرے پیسے واپس کرنا بھول گیا۔ سال پر سال گزرتے رہے مگر قرض کی رقم وہیں کی وہیں رہی۔ جب اس بات کو تین سال ہوگئے تو انہی دنوں ماجھا اور نیاز احمد میں جھگڑا ہوگیا اور ماجھا نے نیاز کا خون کردیا اور عدالت سے عمر اقید کی سزا پاکر وہ جیل چلا گیا۔ انہی دنوں میں نے ماجھا کے باپ کو حویلی بلا کر کہا کہ منافع کی رقم کو میں معاف کردیتا ہوں بس وہ اصل زر مجھے لوٹا دے لیکن اس نے میری بات نہیں مانی۔ میں نے مجبوراً اس کی زمین اپنے قبضے میں کرلی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اسے اگر کچھ اور رقم دے دوں تو وہ اس پانچ ایکڑ اراضی کو میرے نام لگوانے کے لیے تیار ہے۔ میں نے امیر بخش کی موجودگی میں سراج دین کو ایک معقول رقم دے کر مختلف قانونی کاغذات پر اس کے انگوٹھے لگوالیے۔ اس طرح وہ زمین میری ہوگئی۔ باقی جہاں تک ماجھا کی ماں اور بہن کی موت کا معاملہ ہے تو......'' اس نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''صفیہ اور شاداں کی اموات میں میرے بیٹے چودھری انعام کا کوئی ہاتھ نہیں۔ اس رات واقعتاً ڈاکوؤں نے ان کے گھر پر حملہ کیا تھا۔ آپ جانتے ہیں ڈاکو تو لوٹ مار ہی کیا کرتے ہیں۔ اس گھر میں لوٹنے کے لیے کوئی قیمتی شے، سونا چاندی یا نقدی موجود نہیں تھی اس لیے انہوں نے ماجھا کی بہن کو اپنے ظلم کا نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ وہ لوگ شاداں کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ صفیہ نے ان کے اس مقصد کے راستے میں اندھی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو انہوں نے صفیہ کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر وہ شاداں کے تعاقب میں مکان کی چھت پر پہنچ گئے۔ شاداں نے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کو مرتے ہوئے دیکھ لیا تھا لہٰذا اس نے اپنی عزت بچانے کے لیے چھت سے کود کر جان دے دی...... یہ ہے سچائی ملک صاحب! اگر ماجھا افترا پردازی سے کام لے کر اپنے باپ، ماں اور بہن کی اموات کا ملبا میری حویلی پر ڈالنے کے

بارے میں سوچ رہا ہے تو میں اس کی عقل پر ماتم ہی کر سکتا ہوں جناب......!''

چودھری فیروز ان لمحات میں مجھے ''گربہ مسکین'' کی عملی تفسیر نظر آرہا تھا۔ اس نے خود کو دودھ کا دھلا ثابت کرنے کے لیے کسی چالاک روباہ کے انداز میں ایک یکطرفہ کہانی سنائی تھی۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس کہانی میں چودھری نے کہاں کہاں بددیانتی سے کام لیا تھا لیکن میں نے اسے اس امر کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہونے دیا کہ میں اس کے پیش کردہ اس جھوٹوں کے پنچے کے اندر کا احوال جانتا ہوں۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''چودھری صاحب! میری نظر میں آپ کی بات کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ ماجھا کیا سوچتا ہے، میری طرف سے وہ خصماں نوں کھائے اور بھاڑ میں جائے......!''

''یہ ہوئی نا مردوں والی بات......'' وہ خوش ہوگیا۔ ''ملک صاحب! آپ میرے سچے خیرخواہ ہیں۔'' اس نے عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ سے پہلے والے تھانہ انچارج سے میرے دوستانہ تعلقات تھے اور فیض محمد اکثر میری حویلی پر بھی آیا کرتے تھے لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کے ساتھ میری خوب نبھے گی۔ ہمارا گٹھ بندھن فولاد سے بھی زیادہ مضبوط ثابت ہوگا۔''

بات کے اختتام پر چودھری نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے اس کے دستِ دراز کو تھام لیا اور معنی خیز انداز میں کہا۔

''جو اللہ کو منظور چودھری صاحب!''

''میں دوستوں کے لیے اپنے دل اور ہاتھ کو ہمیشہ کھلا رکھتا ہوں ملک صاحب......'' وہ میرے ہاتھ کو پُرمعنی گرمجوشی سے دباتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ اگر آپ کو مجھ سے کسی قسم کا کوئی بھی کام ہو، ہچکچانا نہیں...... آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا......؟''

''جی چودھری صاحب!'' اس کی خوش فہمی کو بانس پر چڑھاتے ہوئے میں نے گردن کو اثباتی جنبش دی اور کہا۔ ''آپ کی اس مہربان پیشکش کے لیے میں تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔ اگر کوئی احتیاج ہوئی تو آپ کو بتاؤں گا۔''

''ہماری دوستی تو سدا شاد و آباد رہے گی ملک صاحب......'' وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولا۔

''اب آپ فوری طور پر ایک اہم کام کریں۔''

''آپ حکم کریں چودھری صاحب!'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''کسی طرح اس منحوس ماجھا کو پکڑ کر دوبارہ جیل بھجوا دیں۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''تف ہے اس ذلیل انسان پر۔ بیٹھے بٹھائے ہم سب کو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ میں تو کہتا ہوں ماجھا پر اس قسم کا کیس بنائیں کہ سیدھا پھانسی کے پھندے تک جائے......''

''آپ فکر نہ کریں چودھری صاحب! میں نے ماجھا کے لیے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''میں اس کی خودبینی کو خاک میں ملا کر رکھ دوں گا لیکن فوری طور پر میرے پیشِ نظر ایک اور اہم کام ہے اور یہ کام ماجھا کی گرفتاری سے پہلے ہونا چاہیے......!''

میں نے آخری الفاظ بڑے پُراسرار انداز میں ادا کیے تھے۔ وہ چونک اٹھا اور چند لمحات تک قیاسہ لگانے والے انداز میں مجھے تکتا رہا پھر جزع بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''ملک صاحب! آپ کس اہم کام کی بات کر رہے ہیں؟''

''چودھری انعام کی حفاظت کا بندوبست......'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''حالات و واقعات کے مطابق ماجھا آج رات انعام کے ساتھ کوئی غیرانسانی کارروائی کرنے کی غرض سے آپ کی حویلی میں گھسے گا۔ میں نے ماجھا کا شکار کرنے کے لیے قلابہ ڈال دیا ہے۔ وہ اور اس کے ساتھی ڈاکو کسی بھی صورت بچ نہیں سکیں گے۔''

''میں سمجھا نہیں ملک صاحب......!'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے ماجھا کو پکڑنے کے لیے کون سا کانٹا ڈالا ہے۔ وہ خاصی تگڑی مچھلی ہے۔ آپ کا قلابہ مضبوط تو ہے نا؟''

''ایک دم لوہا لاٹ چودھری صاحب!'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''آپ تو اپنے طور پر حفاظتی اقدامات کریں گے سو کریں گے، آج صبح سے میں نے بھی اپنے چند سادہ لباس اہلکاروں کو ظفر گڑھ میں تعینات کر دیا ہے۔ وہ گاؤں کے لوگوں میں گھل مل کر آپ کی حویلی پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ وہ سب مسلح ہیں۔ کڑی نگرانی کا یہ کام دن بھر جاری رہے گا اور رات کا اندھیرا پھیلتے ہی میرے بندے کسی کی نگاہ میں آئے بغیر حویلی کے بہت نزدیک آ جائیں گے اور پوری رات جاگ کر...... پہرا دیں گے۔ اگر ماجھا نے آپ کی حویلی کی طرف آنے کی کوشش کی تو اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔''

''یہ تو آپ نے بہت بڑا کام کر دیا ہے ملک صاحب......!'' وہ تشکرانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے

بولا۔ ''بلکہ یوں سمجھیں کہ آپ نے مجھے خرید لیا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میرے بندے اور آپ کے بندے مل کر حویلی کی حفاظت کریں؟''

''میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہوگا۔'' میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''میرے بندوں کا سب کی نگاہوں سے چھپا رہنا ضروری ہے۔ آپ اسے میری حکمتِ عملی سمجھ لیں۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب......!'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ اپنے معاملات کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔''

ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ چودھری انعام وہاں پہنچ گیا۔ اس نے باری باری ہم دونوں کو سلام کیا پھر چودھری فیروز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اکرام بھائی نے بتایا ہے کہ آپ مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے میرے پاس بھی ایک سنسنی خیز خبر ہے......''

''بیٹا جی! پہلے آرام سے بیٹھ جاؤ اور مجھے وہ خبر سناؤ جو تمہارے پاس ہے۔'' چودھری فیروز نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اس کے بعد میں بتاؤں گا کہ تمہیں کس مقصد سے بلایا ہے۔''

وہ ایک کرسی کھینچ کر میرے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ اس دوران میں چپکے چپکے سے میں نے خورونوش کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔ میں کوئی چٹور قسم کا انسان نہیں ہوں لیکن آج صبح میں ڈھنگ سے ناشتا بھی نہیں کر پایا تھا اور اس کے بعد بھاگ دوڑ کا ایک ایسا تھکن رسیدہ سلسلہ شروع ہوا تھا کہ مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت میسر نہیں آئی تھی، پیٹ پوجا تو بہت دور کی بات ہے اور آپ جانتے ہیں کہ موسم سرما میں ایک متحرک انسان کو ویسے بھی زیادہ خوراک کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا جب مجھے چودھری فیروز کی حویلی میں ٹک کر بیٹھنے کا موقع ملا اور انواع و اقسام کی نعمتوں سے سجا ہوا خوان میرے سامنے آیا تو میں تمام تر تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر کام سے لگ گیا تھا......!

''ابا جی......!'' چودھری انعام نے سرسراتی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''ادھر نصیر آباد میں آج سحری کے وقت ڈاکو پٹواری امیر بخش کا ایک ہاتھ کاٹ کر اپنے ساتھ لے گئے ہیں......''

''یہ سارا قصہ ملک صاحب کی زبانی میں سن چکا ہوں۔'' چودھری نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ''انہوں نے ہی صبح امیر بخش کو اسپتال بھیجا تھا۔''

''اوہ اچھا......!'' وہ تشویش بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا پھر مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ نے اس شیطان ماجھا کو اتنی ڈھیل کیوں دے رکھی ہے؟ اس کشتنی کو پکڑ کر پھانسی لگوائیں۔ سارے مسئلے خود بخود حل ہو جائیں گے۔''

''ملک صاحب نے ماجھا کو گرفتار کرنے کے لیے اپنا جال بچھا دیا ہے۔'' چودھری فیروز نے انعام کو بتایا۔ ''وہ جیسے ہی حویلی میں قدم رکھے گا، پکڑ میں آ جائے گا۔''

یکایک چودھری انعام کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے حیرت، غصے اور خوف کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ باری باری ہم دونوں کو دیکھا پھر اپنے باپ سے پوچھا۔

''وہ بدذات ہماری حویلی میں قدم کیوں رکھے گا؟''

جواب میں چودھری فیروز نے سمجھانے والے انداز میں اسے حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا اور آخر میں کہا۔ ''میں نے اسی لیے تمہیں بلایا ہے بیٹا جی۔ ابھی چند روز تک آپ حویلی سے باہر نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے......''

''ابا جی...... اس زلّہ ربا کی اتنی ہمت کہ ہمیں للکارے گا۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ کی نرمی نے ان کمین لوگوں کو اتنی ہمت دی ہے۔ ہمیں بہت پہلے ماجھا کا کوئی مناسب بندوبست کر دینا چاہیے تھا۔''

اس وقت ان باپ بیٹے کے درمیان بات ہو رہی تھی لیکن میری توجہ کا مرکز چودھری انعام کا چہرہ تھا۔ جب چودھری فیروز اسے شاداں کی خودکشی والے واقعے کے حوالے سے، ماجھا کے خطرناک عزائم سے محتاط رہنے کی تلقین کر رہا تھا تو میں نے انعام کی آنکھوں میں سراسیمگی ہلکورے لیتے دیکھی تھی اور اس کے چہرے پر بھی تشویش بھری گھٹا امڈ آئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ اس افسوسناک واقعے کا ذمے دار چودھری انعام ہی تھا۔ اسی کے بھیجے ہوئے بندے ڈاکوؤں کے بہروپ میں شاداں کو اٹھانے گئے تھے۔ نتیجے میں مزاحمت کرنے پر شاداں کی ماں صفیہ بی بی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور شاداں نے چھت سے کود کر جان دے دی تھی۔ اگر چودھری انعام کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو اس کی شکل پر یوں بارہ نہ بج رہے ہوتے......!

''جب میں ہوں تو پھر آپ لوگوں کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے براہِ راست چودھری انعام کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب ماجھا کے مناسب اور نامناسب سارے بندوبست میں نے ہی کرنا ہے۔ ویسے تو یہ حویلی کسی دمدمے سے کم نہیں ہے لیکن دو رات پہلے اسی حویلی میں بڑے چودھری صاحب کے ساتھ جو واقعہ پیش آ چکا ہے

اس کو دیکھتے ہوئے حد سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ میں نے جو انتظامات کیے ہیں ان کی تفصیل میں چودھری صاحب کو بتاچکا ہوں مگر خاص طور پر تمہاری حفاظت کے حوالے سے بھی میرے ذہن میں کچھ ہے......!''

''کیا؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

چودھری فیروز بھی سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''میں ابھی تھانے پہنچ کر اپنے اسٹاف کے ایک خاص شخص کو سادہ لباس میں یہاں بھیج دوں گا۔'' میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''وہ پولیس اہلکار مسلح ہوگا اور پوری رات تمہارے کمرے میں بطور محافظ موجود رہے گا۔ اسے مجرموں سے نمٹنے کے ایک سو ایک گر آتے ہیں لہٰذا تمہیں خوف زدہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔''

وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب۔''

میں چودھری فیروز اور اس کے بیٹے کے ساتھ بے حد سنجیدگی سے جو بھی مائنڈ گیم کھیل رہا تھا، وہ میرے اور حوالدار خادم حسین کے درمیان طے ہونے والے ایک منصوبے کا حصہ تھا۔ یہ ذہنی اور نفسیاتی کھیل دراصل اس کم ظرف فیملی کے گندے انڈوں کو بے نقاب کرنے کی غرض سے رچایا گیا تھا۔ اس اسکرپٹ کے مطابق میں آج کی رات خادم حسین کو چودھری انعام کے کمرے میں پہنچانے والا تھا۔ خود میری مصروفیات بھی کم پراسرار نہیں تھیں۔

''چودھری صاحب! اب میں اجازت چاہوں گا۔ بہت سارے کام میرے سر پر سوار ہیں۔'' میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں...... یہ بھی بتادیں کہ آپ کی ٹانگ کا کیا کرنا ہے۔ وہ باہر تانگے میں رکھی ہوئی ہے...... آپ کی امانت کے طور پر......!''

''جب وہ دوبارہ میری ٹانگ کے ساتھ جوڑی نہیں جاسکتی تو پھر میں اس کا کیا کروں گا......!'' وہ ایک حسرت بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''یہ تو ایک سفاک حقیقت ہے کہ اب آپ کو اپنی بائیں ادھوری ٹانگ کے ساتھ ہی باقی کی زندگی گزارنا ہوگی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن وہ چونکہ نصف صدی تک آپ کے بدن کا حصہ رہی ہے اس لیے میں نے آپ سے پوچھ لیا......''

''آپ اسے اندر منگوائیں۔'' چودھری انعام نے مجھ سے کہا۔ ''ابا جی کو اس کا دیدار کرانے کے بعد ہم اسے اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کرادیں گے۔''

چودھری انعام نے ایک طفلانہ بات کی تھی لیکن میں نے اس پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''ٹانگ کا وہ حصہ اب ایسا نہیں رہا کہ اس بوری کو یہاں حویلی کے اندر لاکر کھولا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو پوری حویلی میں اس کی بساند پھیل جائے گی۔''

''ملک صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹا جی!'' چودھری فیروز نے میری طرف داری کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ملازموں سے کہہ کر وہ بوری تانگے سے اتروالو اور انہیں تاکید کردو کہ وہ ابھی اور اسی وقت اسے لے جاکر کہیں دفن کردیں۔''

آئندہ دس منٹ میں، میں نے چودھری فیروز کی بوری بند بساندی ٹانگ کو اس کے فرزند صغیر کے سپرد کیا اور کانسٹیبل رئیس کے ساتھ تانگے پر سوار ہوکر حویلی سے روانہ ہوگیا۔

تھانے کا رخ کرنے سے پہلے میں نے ظفر گڑھ کا ایک راؤنڈ لگانا ضروری سمجھا۔ یہ سب میرے منصوبے کا حصہ تھا۔ دو تین جگہ رک کر میں نے لوگوں سے ہلکی پھلکی بات چیت بھی کی۔ خاص طور پر نذیر حسین کے گھر کے سامنے اپنا تانگا رکوا کر میں گھر کے اندر بھی گیا اور نذیر حسین، اس کی بیوی شگفتہ بی بی اور ان کی بیٹی تاجی سے بھی رسمی علیک سلیک کی۔ تاجی کی عمر بیس سال تھی اور وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ تاجی معصوم صورت والی ایک دلکش و دلنشین لڑکی تھی۔ چاہِ ذقن نے اس کی خوب صورتی کو چار چاند لگادیے تھے۔

جی ہاں...... میں اسی تاجی کی بات کررہا ہوں جو اس کہانی کے مرکزی کردار معراج دین عرف ماجھا کی محبوبہ تھی!

☆☆☆

رات کے دس بجے تھے لیکن ایسا محسوس ہورہا تھا کہ آدھی رات سے زیادہ گزر چکی ہو۔ ایک تو موسم سرما میں غروب آفتاب کافی جلدی ہوجاتا ہے، دوسرے گاؤں دیہات میں بسنے والے لوگوں کی شہری لوگوں کی طرح نوع بہ نوع مصروفیات بھی نہیں ہوتیں کہ وہ رات گئے تک جاگتے رہیں۔ اس وقت ماحول خاموش اور فضا ساکت تھی اور اس ٹھنڈے ٹھار سناٹے میں موضع ظفر گڑھ سہانی نیند کے مزے لے رہا تھا۔

میں اس وقت اپنے ایک چاق و چوبند کانسٹیبل امجد علی کے ساتھ نذیر حسین کے گھر میں موجود تھا۔ ہم سادہ لباس میں تھے اور پوری تیاری کے ساتھ وہاں آئے تھے۔ میرے پاس اپنا سروس ریوالور تو موجود تھا ہی۔ علاوہ ازیں میں نے امجد کو بھی ایک رائفل تھمادی تھی تاکہ بوقت ضرورت کام آسکے۔ میری توقع کے عین مطابق آج رات کسی وقت نذیر حسین کے گھر پر چودھری کے بھیجے ہوئے ڈاکو حملہ کرنے

والے تھے اور میری یہ توقع اس خفیہ منصوبے کی رہینِ منت تھی جو میں نے خادم حسین کے ساتھ مل کر بنایا تھا۔ خادم حسین اس وقت چودھری فیروز کی حویلی میں چودھری انعام کی حفاظت کا کام سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کی ہنگامی مدد کے لیے حویلی کے گیٹ کے نزدیک ہی کانسٹیبل مختار احمد نے مورچا سنبھال رکھا تھا۔ دوسرے کانسٹیبل فضل محمود کو واپس تھانے بلالیا گیا تھا۔ اس رات تھانے میں میرے اسٹاف کے کُل چار افراد موجود تھے۔ کانسٹیبلو فضل محمود، رئیس اور امانت علی اور ہیڈ کانسٹیبل فرید احمد۔ میں نے تھانہ سنبھالنے کی ذمے داری فرید احمد کو سونپ دی تھی۔ ہماری واپسی تک ان چاروں نے تھانے میں ریڈ الرٹ رہنا تھا اور مجھے امید تھی کہ ہم لوگ صبح سے پہلے اپنی مہم سر کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

اس مہم کے بنیادی طور پر تین حصے تھے۔ حصۂ اول میں خادم حسین نے بڑی صفائی کے ساتھ محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے چودھری انعام کے دماغ میں یہ بات بٹھا نا تھی کہ ملک صاحب آج ظفر گڑھ میں نذیر حسین سے مل کر گئے تھے۔ نذیر حسین اور اس کے گھر والوں نے ماجھا کی حمایت کرتے ہوئے چودھری فیروز اور اس کے چھوٹے بیٹے انعام کے خلاف بہت زہر اگلا ہے۔ یہ کہانی سننے کے بعد ملک صاحب نے ان لوگوں سے کہا کہ کیا وہ تھانے آکر یہ ساری باتیں اپنے بیانات حلفی میں لکھوا سکتے ہیں؟ نذیر حسین، اس کی بیوی شگفتہ اور بیٹی تاجی نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ ہم چودھریوں سے ڈرتے نہیں ہیں۔ ان جابروں نے تو ظلم کی انتہا کردی ہے۔ ماجھا کا تو سارا خاندان ہی برباد ہوگیا اور وہ خود ایک بھولے بھالے دیہاتی سے خطرناک ڈاکو بن گیا۔ اب ہم سے اور برداشت نہیں ہوتا۔ اگر چودھریوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے ہمیں زبان کھولنا پڑی تو ہم سارا سچ کھول کر بیان کردیں گے۔ پھر انہوں نے بہ یک زبان ہوکر ملک صاحب کو یقین دلایا کہ وہ کل صبح تھانے آکر اپنے بیانات لکھوادیں گے۔

خادم حسین کی اس ''کاشت کاری'' کے نتیجے میں انعام نے فوراً جاکر اپنے باپ کو رپورٹ کرنا تھی۔ پھر وہ لوگ صرف اور صرف ایک ہی کام کرسکتے تھے...... کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے نذیر حسین، شگفتہ اور تاجی کو کسی بھی قسم کا بیان دینے کے قابل نہ چھوڑنا اور اس کام کے لیے آدھی رات کے آس پاس کا وقت سب سے زیادہ مناسب تھا۔ خادم حسین کی سنائی ہوئی اس فتنہ پرداز کہانی پر چودھری فیروز اینڈ کمپنی نے اس لیے بھی آنکھیں بند کرکے یقین کرلینا تھا کہ میں نے حویلی سے نکلنے کے بعد جو ظفر گڑھ کا راؤنڈ لگایا تھا اور نذیر حسین کے گھر کے اندر بھی گیا تھا، میری اس تمام تر مصروفیت کی رپورٹ چودھری فیروز تک پہنچ گئی ہوگی۔ میں نے اسی مقصد کے حصول کی خاطر دن میں دانستہ ظفر گڑھ کا مصنوعی دورہ کیا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اب تک خادم حسین نے اپنے حصے کا کام کردیا ہوگا اور کسی وقت بھی موت کے ہرکارے شب خون مارنے نذیر حسین کے گھر پر یلغار کرسکتے تھے۔

میرے منصوبے کے حصۂ دوم پر عمل کرنے کے لیے میں کانسٹیبل امجد کے ساتھ نذیر حسین کے گھر میں موجود تھا تاکہ چودھریوں کے بھیجے ہوئے سفاک قاتلوں کو راتوں رات آہنی زیورات سے آراستہ کرکے تھانے کی حوالات تک پہنچا سکوں اور اگلی صبح سے پہلے ان کی تسلی بخش ''خاطر داری'' کرنے کے بعد فرداً فرداً سب کے حلفیہ بیانات سپردِ قلم کرکے ان کے انگوٹھے لگوالوں لیکن میں نے نذیر حسین اور اس کی بیوی و بیٹی کو کوئی اور کہانی فٹ کررکھی تھی۔

میں نے آج دن ہی میں نذیر حسین کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ مجھے خفیہ اطلاع ملی ہے کہ آج رات ماجھا اپنے ساتھی ڈاکوؤں کے ساتھ اس کے گھر پر ہلّا بولے گا اور وہ لوگ تاجی کو اٹھالے جائیں گے۔ نذیر حسین، ماجھا کو ناپسند نہیں کرتا تھا مگر کوئی بھی باپ اپنی بیٹی کو کسی ڈاکو سے بیاہنے کا فیصلہ نہیں کرسکتا۔ جب سے تاجی کے والدین کو یہ پتا چلا تھا کہ ماجھا جیل سے فرار ہوکر ایک خطرناک ڈاکو بن گیا ہے اور پولیس علاقے کے چپے چپے پر اس کی گرفتاری کے لیے چھاپے مار رہی ہے، ان لوگوں نے جلد از جلد تاجی کا رشتہ پڑوس میں رہنے والے ایک لڑکے ساجد سے پکا کردیا تھا اور آئندہ ماہ ان کی شادی ہونے والی تھی۔ میری بات سن کر نذیر حسین نے مجھ سے دست بستہ یہ درخواست کی تھی کہ میں کسی طرح اس کی بیٹی کو اغوا ہونے سے بچالوں اور میں اس وقت ان لوگوں کی مدد اور حفاظت ہی کی خاطر وہاں موجود تھا...... جی ہاں، بعض اوقات اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہم پولیس والوں کو اس نوعیت کے ناٹک بھی رچانا پڑتے ہیں......!

ہمارے پروگرام کا حصۂ سوم حوالدار خادم حسین سے متعلق تھا۔ اگر وہ سلسلی وارداتیا ماجھا آج رات چودھری انعام کے ساتھ کوئی اونچ نیچ کرنے کی نیت سے حویلی میں گھسا تو خادم حسین نے کانسٹیبل مختار کے ساتھ مل کر اسے

زندہ یا مُردہ گرفتار کرنا تھا۔

اپنے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہم نے ہر مرحلے کو بڑی ہوش مندی اور احتیاط کے ساتھ نمٹانا تھا۔ اسی لیے میں نے نذیر حسین کے گھر کے بڑے کمرے میں تین چارپائیوں پر تکیے رکھ کران کے اوپر گرم لحاف اس طرح اوڑھا دیے تھے کہ دیکھنے والے کو ان چارپائیوں پر تین انسان گہری نیند سوتے نظر آتے۔ لحافوں کے نیچے لمبائی کے رخ پر تکیے اس طرح رکھے گئے تھے کہ وہ صحیح معنوں میں سوتے ہوئے انسان ہی دکھائی دیں۔ مذکورہ کمرے کے داخلی دروازے کو دانستہ نیم وار کھا گیا تھا تاکہ متوقع حملہ آوروں کو اپنے شکاروں کو ڈھونڈنے کے لیے زیادہ محنت نہ کرنا پڑے۔ اس کمرے سے ملحقہ کمرے میں، میں نذیر حسین کے ساتھ گپ شپ کررہا تھا جبکہ تیسرے کمرے میں کانسٹیبل امجد نے تاجی اور اس کی ماں شگفتہ بی بی کو اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔

”میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں تھانے دار صاحب......!“ نذیر حسین نے لجاجت بھرے انداز میں کہا۔ ”اگر آج رات آپ یہاں موجود نہ ہوتے تو ہماری بےخبری میں ماجھا نے تاجی کو اٹھا لے جانا تھا پھر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ میں نے تو قدیر حسین کے بیٹے سے تاجی کا رشتہ پکا کررکھا ہے......“

”نذیر حسین! قانون عوام کی حفاظت اور مجرموں کی سرکوبی کے لیے بنائے جاتے ہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں یہاں پر اپنا فرض پورا کرنے آیا ہوں۔ اس میں تم لوگوں پر احسان والی کوئی بات نہیں۔ یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ تاجی کا رشتہ طے کردیا۔ ماجھا چاہے کتنا بھی اچھا انسان کیوں نہ ہو لیکن درحقیقت وہ ایک مفرور قیدی اور خطرناک مجرم ہے۔ پچھلی دو راتوں میں اس نے ظفرگڑھ اور نصیرآباد میں جو کچھ کیا ہے وہ سب تمہارے علم میں ہے۔ قانون اسے کسی بھی صورت معاف نہیں کرے گا۔ جلد یا بہ دیر ماجھا کا زندہ یا مُردہ پکڑا جانا لازمی ہے......“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب!“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”بس، آج آپ کسی بھی طرح ماجھا کو گرفتار کرکے اپنے ساتھ لے جائیں تاکہ میں سکون سے تاجی کو باعزت انداز میں اس گھر سے رخصت کرسکوں۔ میری ایک ہی اولاد ہے۔ تاجی کو ہم نے بڑے لاڈ پیار سے پروان چڑھایا ہے۔ ہم بڈھی بڈھا نے تو اپنی زندگی گزار لی ہے۔ پتا نہیں کس وقت رب کا بلاوا

آجائے۔ اگر ہماری آنکھ بند ہونے سے پہلے تاجی کا گھر بس جائے تو اس سے بڑی شکر کی اور کوئی بات نہیں۔''

اس وقت ہم دونوں گرم لحاف اوڑھے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں ایک مجبور باپ کی مشکلات کو بڑی گہرائی سے محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''یہ تاجی کا ہونے والا خاوند کام کیا کرتا ہے؟''

''قدیر حسین اور کوثر بی بی کی بھی ایک ہی اولاد ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''ان لوگوں کی تھوڑی سی زرعی اراضی ہے۔ ساجد کھیتی باڑی میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ وہ بہت ہی سادہ طبیعت کا ایک سمجھ دار جوان ہے۔ اسے بیٹی دینے میں ہمارے لیے سب سے زیادہ اطمینان اور خوشی کی بات یہ ہے کہ تاجی بیاہ کر کسی دور دیس نہیں جائے گی۔ اس کے میکے اور سسرال میں صرف ایک دیوار کا فاصلہ ہے۔''

''چلیں، یہ تو اچھا ہی ہوا......'' میں نے معتدل انداز میں کہا، پھر پوچھا۔ ''ساجد کے ساتھ تاجی کا رشتہ طے کرنے میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟ میرا مطلب ہے...... تاجی کا پہلے ماجھا کے ساتھ معاملہ چل رہا تھا نا......؟''

''نہیں جناب! مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ بات ہمارے علم میں تھی کہ ساجد، تاجی کو دل سے پسند کرتا تھا مگر ماجھا کی وجہ سے اس نے کبھی اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ساجد ٹھہرے ہوئے مزاج کا ایک امن پسند لڑکا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ تاجی، ماجھا کے ساتھ سنجیدہ ہے اسی لیے اس نے زبان کھولنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور ماجھا کے جیل جانے کے بعد حالات بدل گئے پھر جب اس کے فرار ہونے کی خبر اڑی تو معاملات اور بھی خراب ہو گئے۔ اسی لیے ہم نے جلد از جلد تاجی کا رشتہ ساجد کے ساتھ پکا کر دیا۔ اس بات کے امکانات روشن نظر آنے لگے تھے کہ ماجھا کسی بھی وقت ہمارے گھر کا رخ کر سکتا ہے اور ظاہر ہے...... یہ کوئی مناسب بات نہیں تھی۔''

''کیا اس موقع پر تاجی نے کسی قسم کی مزاحمت کی؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''پہلے تو وہ شادی ہی سے انکاری تھی۔'' نذیر حسین نے بتایا۔ ''ہم اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ ماجھا اس کے دل و دماغ سے نکلا نہیں ہے لیکن میں نے اور شگفتہ نے بڑے پیار سے اسے سمجھایا۔ حالات کی حقیقت سے اسے آگاہ کیا تو بات اس کے دماغ میں بیٹھ گئی۔ ہم نے بڑے واضح الفاظ میں اسے باور کرا دیا تھا کہ ماجھا ایک مفرور ڈاکو ہے۔ اس کے نصیب میں یا تو جیل کی چار دیواری ہے اور یا پھر پولیس کی گولی۔ وہ یا تو گرفتار ہوگا یا کسی پولیس مقابلے میں بے دردی سے مارا جائے گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ تاجی نے بوڑھے ماں باپ کی عزت کی لاج رکھ لی اور ساجد سے شادی کے لیے تیار ہو گئی......''

''تم اور تمہاری بیوی خوش قسمت والدین ہیں نذیر حسین۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جو تاجی جیسی فرمانبردار اولاد آپ لوگوں کو ملی۔ اللہ تاجی کا نصیب اچھا کرے۔''

''آمین......!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''ظفر گڑھ میں تم لوگوں کے علاوہ اور کسی کو یہ تو معلوم نہیں کہ میں تمہارے گھر میں ماجھا کی گرفتاری کے لیے گھات لگائے بیٹھا ہوں؟''

''نہیں سرکار......'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے دن میں مجھے سختی سے منع کر دیا تھا۔ میں نے آپ کی ہدایات کو یاد رکھا ہے حتیٰ کہ ساجد اور اس کے ماں باپ کو بھی اس معاملے کی کوئی خبر نہیں ہے۔''

''شاباش نذیر حسین!'' میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''یہ تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر کمرے کے دروازے پر ہلکی دستک سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ کانسٹیبل امجد نے حملہ آوروں کی آمد کا اعلان کر دیا ہے۔ امجد، تاجی اور شگفتہ کے ساتھ جس کمرے میں تھا اس کی کھڑکی سے گھر کے صحن اور داخلی دروازے پر بہ آسانی نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ ہمارے بیچ یہ طے ہوا تھا کہ وہ جیسے ہی کسی کو نذیر حسین کے گھر میں داخل ہوتے دیکھے، فوراً مجھے اطلاع دے اور اطلاع اسی طرح دستک سے دینا تھی......!

''نذیر حسین! ڈاکو آ گئے ہیں......'' یہ کہتے ہوئے میں لحاف سے نکل آیا اور دروازے کی جانب بڑھا۔

''ہاں امجد......؟'' میں نے دروازے کے نزدیک پہنچ کر سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا پوزیشن ہے؟''

''تین بندے دیوار پھلانگ کر گھر کے صحن میں اترے ہیں۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''وہ تینوں مسلح ہیں اور انہوں نے ڈاکوؤں کے انداز میں ڈھاٹے بھی باندھ رکھے ہیں اور...... وہ چوکنا انداز میں اس کمرے کی سمت پیش قدمی کر رہے ہیں جہاں ہم نے ان کے لیے جال پھیلا رکھا ہے۔''

''بہت خوب......'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے

میں کہا۔ ”جب وہ لوگ مذکورہ کمرے میں داخل ہو جائیں تو تم نے مجھے اطلاع دینا ہے اور تاجی و شگفتہ کو نذیر حسین کے پاس بھیج دینا ہے اسی دروازے سے۔ اس کے بعد ہم اگلے مرحلے پر عمل کریں گے۔“

اوکے سر!“ امجد نے پُراعتماد انداز میں کہا۔

میں نذیر حسین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”تاجی اور شگفتہ جیسے ہی اس کمرے میں آئیں، تم تینوں نے چارپائیوں کے نیچے گھس کر چپ سادھ لینا ہے......“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”باہر فائرنگ کی آواز سنائی دے، زلزلہ آئے یا کوئی طوفان، تم لوگوں نے اپنی جگہ نہیں چھوڑنا، اِلّا یہ کہ میں خود آواز دے کر تمہیں باہر نکلنے کو نہ کہوں۔ میری بات تمہارے پلّے پڑ رہی ہے یا نہیں......؟“

وہ بڑی سرعت سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھ گیا تھانے دار صاحب......“

میں برآمدے کی سمت کھلنے والے دروازے کے ساتھ لگ کر مستعدی سے کھڑا ہو گیا اور اپنی تمام تر سماعت کو بیرونی ماحول پر لگا دیا۔ چند سیکنڈ کے بعد فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ چودھری انعام کے بھیجے ہوئے تین ڈاکوؤں نے بڑے کمرے میں داخل ہو کر اپنی دانست میں نذیر حسین، اس کی بیوی شگفتہ اور ان کی بیٹی تاجی کو سوتے میں گولیوں سے بھون ڈالا تھا......!

جیسے ہی امجد نے خواتین کو اس کمرے میں منتقل کیا، میں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور ریوالور سونتے برآمدے سے گزر کر صحن میں نکل آیا۔ نذیر حسین کے گھر کے وہ تین کمرے ایل (L) کی شکل میں بنے ہوئے تھے۔ مکان کے عقبی حصے میں دو کمرے ایک ہی سائز کے تھے جن میں سے ایک میں امجد، ان ماں بیٹی کے ساتھ چھپا تھا اور دوسرے میں، میں نے نذیر حسین کے ساتھ پناہ لے رکھی تھی۔ ان دونوں کمروں میں ایک ایک دروازہ اور ایک ایک کھڑکی تھی جن کا رخ برآمدے کی جانب تھا۔ علاوہ ازیں دونوں کمروں کو آپس میں ملانے کے لیے ان کی درمیانی دیوار میں بھی ایک چھوٹا سا دروازہ رکھا گیا تھا۔ میرے اور امجد کے بیچ اسی ملاپی دروازے کے توسط سے بات چیت ہوئی تھی اور امجد نے مذکورہ دروازے ہی سے تاجی اور شگفتہ کو ادھر بھیجا تھا۔ امجد نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے باہر کا منظر دیکھ کر مجھے مطلع کیا تھا۔ تیسرا بڑا کمرا لسبائی کے رخ پر ان دو کمروں کے پہلو میں جڑا ہوا تھا۔

میرے باہر پہنچنے سے پہلے ہی امجد نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے کمرے کے دروازے پر باہر سے کنڈی چڑھا دی تھی جس کے نتیجے میں وہ تینوں مسلح ڈاکو تین ”انسانی لاشوں“ کے ساتھ بڑے کمرے میں مقید ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ ساری کارروائی میرے سوچے ہوئے منصوبے کے عین مطابق عمل میں آئی تھی۔ نذیر حسین اپنی بیوی اور بیٹی کے ہمراہ ایک کمرے میں محفوظ تھا اور وہ ڈاکو میرے لگائے ہوئے پھندے میں پھنس چکے تھے۔

بڑے کمرے میں تین انسانوں کے سونے کا ڈرامائی جال بچھاتے ہوئے ہم نے دانستہ اس کی کھڑکی کو کھلا اور داخلی دروازے کو نیم وا چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ سیدھے اسی کمرے کا رخ کریں۔ جب کانسٹیبل نے اس کمرے کو باہر سے کنڈی لگائی تو وہ سمجھ گئے کہ ان کے ساتھ ہینڈ ہو گیا ہے۔ اب وہ دروازے کو شدت سے پیٹتے ہوئے غضب ناک انداز میں چلا رہے تھے۔

”دروازہ کھولو...... ورنہ ہم تمہارا برا حشر کر دیں گے۔“

میں اور امجد دروازے سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر کسی بھی ہنگامی کارروائی کے لیے ایک دم تیار کھڑے تھے۔ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

”تم لوگ ڈاکو ہو، قاتل ہو...... تم نے ابھی سوئے ہوئے تین معصوم افراد کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ تمہیں اپنے عبرت ناک حشر کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ اپنی بندوقیں کھڑکی کے راستے باہر پھینک دو......!“

”بکواس بند کرو......!“ ان میں سے ایک نے جھلّا کر کہا۔ ”ہم نے کسی کی جان نہیں لی۔ یہاں پر کوئی بندہ بشر موجود تھا ہی نہیں۔ ہم نے تینوں چارپائیوں کو اچھی طرح چیک کر لیا ہے۔ ہمیں الو بنانے کے لیے تم نے یہ سارا ڈراما رچایا تھا۔ آخر تم ہو کون......؟“

”تم اس جھمیلے میں نہ پڑو کہ میں کون ہوں......“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”شکر مناؤ کہ تم لوگ انسانی خون میں ہاتھ رنگنے سے صاف بچ گئے اور یہ سب اسی ڈرامے کے طفیل ہوا ہے جو تمہارے بقول میں نے تمہیں الو بنانے کے لیے رچایا ہے۔ اب تم پر قتلِ عمد نہیں بلکہ اقدام قتل کا مقدمہ بنے گا۔ تم سزائے موت سے بچ جاؤ گے۔“

”تم تو ہمیں قتلِ عمد اور اقدام قتل کے بارے میں اس طرح بتا رہے ہو جیسے تم کوئی وکیل یا پھر پولیس والے ہو......؟“ اندر سے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا گیا۔

اس دوران میں وہ لوگ وقفے وقفے سے بند دروازے کو بھی پیٹ رہے تھے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ

باہر میں اکیلا ہوں یا میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ میں نے اس کھیل کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اور بہ آوازِ بلند کہا۔

''میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں اس علاقے کا تھانہ انچارج ہوں۔ مجھے اپنے باخبر ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ تم تینوں نذیر حسین، شگفتہ اور تاجی کو فنا کے گھاٹ اتارنے آج رات یہاں دھاوا بولو گے لہٰذا میں نے تمہیں چھاپنے کے لیے پہلے سے بندوبست کرلیا۔ اب تم شرافت سے اپنی بندوقوں کو کھڑکی سے باہر پھینکو اور گرفتاری دے دو۔ مزاحمت کرو گے تو میں تمہیں اڑانے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لوں گا۔''

نذیر حسین کے گھر میں جتنی بھی چوبی کھڑکیاں تھیں ان میں عمودی انداز میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں، جن کی موٹائی آدھے انچ کے برابر تھی اور دو سلاخوں کے درمیان لگ بھگ ساڑھے تین انچ کا فاصلہ رکھا گیا تھا۔ اس گیپ کے راستے وہ لوگ بہ آسانی اپنی بندوقوں کو باہر پھینک سکتے تھے لیکن خود وہاں سے بھاگ نکلنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے چاہے وہ کسی سرکس میں کام کرنے والے لینڈو ہی کیوں نہ ہوتے۔

''ہم کیسے یقین کرلیں کہ تم تھانے دار ہی ہو......!''

مجھ سے بات کرنے والے نے شک زدہ انداز میں کہا۔ ''اور یہ بھی کہ تمہارے باخبر ذرائع کی اطلاع پکی ہے۔ تم کوئی اور بھی تو ہوسکتے ہو اور ہمیں پھنسانے کے لیے یہ چال چل رہے ہو......''

''میں اپنے تھانے کے ٹرائل روم میں جب تم لوگوں کی تشریف جات پر لوچار کے چرمی لتر برساؤں گا تو خود بخود تمہیں میری شناخت ہوجائے گی۔'' میں نے زہرخند انداز میں کہا۔ ''باقی میرے ذرائع بڑے وثوق دار ہیں لہٰذا یہ اطلاع غلط نہیں ہوسکتی۔ تم لوگوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی چارپائیوں پر بے دریغ فائرنگ کی ہے۔''

وہ تم سے آپ پر آتے ہوئے لکنت زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''آپ کو...... ہمارے بارے میں کس نے...... بتایا ہے......؟''

''تمہارے شیطانی باپ چودھری انعام نے......!''

میں نے نظریۂ ضرورت کے تحت قصداً غلط بیانی کرتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

''یہ...... یہ نہیں...... ہوسکتا......!'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

اس کے لہجے میں حد درجہ حیرت اور بے یقینی پائی جاتی تھی۔ میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے دریافت کیا۔

''کیوں نہیں ہوسکتا؟''

''کیونکہ چھوٹے چودھری صاحب ہی نے تو ہمیں......!''

وہ بولتے بولتے یکایک رک گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ وہ اس سے آگے اور کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ میرے اس خطرناک باؤنسر پر کمرے کے اندر خاموشی چھا گئی تھی۔ اب ان میں سے کوئی دروازے کو بھی نہیں پیٹ رہا تھا۔ ایک بات تو طے تھی کہ چودھری انعام کا نام سن کر ان تینوں کے تعزیے ٹھنڈے ہوگئے تھے۔ میں نے کڑک دار آواز میں کہا۔

''میں تم تینوں کو آخری بار کہہ رہا ہوں کہ اگر مجھ سے کسی نرمی کی توقع رکھتے ہو تو اپنے ہتھیار کھڑکی سے باہر پھینک کر گرفتاری دے دو ورنہ میں تمہارا بہت برا حشر کروں گا۔ میں تین تک گن رہا ہوں۔ اگر تم لوگوں نے پسپائی اختیار نہیں کی تو تم تینوں بڑی دردناک موت مرو گے...... ایک!''

کمرے کے اندر پراسرار سناٹے نے اپنا قبضہ جمالیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان تینوں کو کسی موذی سانپ نے سونگھ لیا ہے۔ میں نے اپنی آواز کو بلند رکھتے ہوئے گنتی کو آگے بڑھایا۔

''دو......!''

اس ''دو'' کے جواب میں کھڑکی کے راستے یکے بعد دیگرے دو بندوقیں باہر پھینک دی گئیں۔ میں نے بندوقوں کو قبضے میں لینے کے بعد دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''کوئی وعدہ وعید نہیں، کوئی تقدیم و تاخیر نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم میں سے ہر ایک کے پاس آتشیں ہتھیار موجود ہے۔ جب تک تیسری بندوق باہر نہیں پھینکو گے، میں دروازہ نہیں کھولوں گا...... تین!''

''تین'' نے عمل انگیز کا اثر دکھایا اور تیسری بندوق بھی کمرے سے باہر آگئی۔ اب وہ تینوں نہتے ہوچکے تھے۔ میں نے دھیمی آواز میں کانسٹیبل کو ہدایات دیں۔

''امجد! تم پوزیشن سنبھال کر اندھیرے میں ایک دم چاق و چوبند کھڑے ہوجاؤ۔ میں دروازہ کھول رہا ہوں۔ اگر ان کمینوں نے شرافت سے گرفتاری دے دی تو ٹھیک بصورت دیگر تم کوئی آسرا نہیں کرنا۔ ہم نے انہیں زندہ پکڑنا ہے۔ اگر یہ شیطان بھاگنے کی کوشش کریں تو ان کی ٹانگوں کو نشانہ بنا کر گولی چلا دینا......''

''سمجھ گیا سرجی......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں

گا......'' پھر اس نے عجیب سے لہجے میں اضافہ کیا۔ ''ملک صاحب! کبھی کبھار تو گن چلانے کا موقع ملتا ہے۔ میں اس سنہری موقع کو بھلا کیسے ضائع کرسکتا ہوں!''

امجد کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں چودھری انعام کے بھیجے ہوئے تین خبیث الاخبث ناسوروں کی جانب متوجہ ہوگیا اور میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تم لوگوں نے قانون سے تعاون کرکے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔ میں تم سے خصوصی رعایت کروں گا۔ اب میں دروازہ کھول رہا ہوں۔ اپنے ہاتھ گردن کے پیچھے رکھ کر چپ چاپ باہر نکل آؤ۔ مجھے کسی زورزبردستی پر مجبور نہیں کرنا ورنہ اس گھر کے صحن میں تمہاری بے گوروکفن لاشیں بچھی نظر آئیں گی......!''

پھر میں نے تیسری بندوق کو بھی اپنے قبضے میں لینے کے بعد بہ آہستگی دروازے کی کنڈی ہٹا دی اور تھوڑے فاصلے پر ریوالور بہ دست کھڑا ہوگیا۔

وہ تینوں لائن بنا کر یکے بعد دیگرے کمرے سے باہر نکل آئے۔ میری ہدایت کے عین مطابق انہوں نے اپنے ہاتھوں کو گردنوں کے پیچھے باندھ رکھا تھا۔ امجد رائفل سونتے ایک ایسی جگہ پر کھڑا تھا کہ وہ تینوں اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ جب وہ برآمدے میں پہنچ گئے تو میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''تم تینوں زمین پر اکڑوں بیٹھ کر اپنے ہاتھ پشت کی طرف کرلو تاکہ میں تمہیں الٹی ہتھکڑی لگادوں۔''

مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح چونک اٹھے تھے اور اس کا سبب بھی فوراً ہی میری سمجھ میں آگیا۔ میں اس وقت یونیفارم میں ملبوس نہیں تھا۔ یقیناً انہیں یہ شک ہوا ہوگا کہ میں تھانے دار نہیں ہوں۔ میں نے پولیس کا نام استعمال کرکے انہیں بے وقوف بنایا ہے۔ میرے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات ہوں یا ان کی سوچ میں سر اٹھانے والی بے یقینی...... یہ سب کچھ سیکنڈ کے دسویں حصے میں پیش آیا تھا۔ اس کے بعد ان تینوں نے ایک ایسی حرکت کی جس کے امکان کو میں نے ایک لمحے کے لیے بھی نظرانداز نہیں کیا تھا۔ میرے ہاتھ میں موجود ریوالور کی پروا کیے بغیر ان تینوں نے باہر کی جانب دوڑ لگادی تھی......!

اگلے ہی لمحے امجد کی رائفل گرجی۔ اس نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے تھے۔ اس فائرنگ کے جواب میں فضا گھائل افراد کی چیخوں سے گونج اٹھی پھر میں نے ان تین میں سے دو کو لڑکھڑا کر زمیں بوس ہوتے دیکھا۔ تیسرا خوش قسمتی سے بچ نکلا تھا اور اس نے اندھا دھند دروازے کی جانب دوڑ لگادی تھی۔

''تم ان زخمی مکینوں کو دیکھو۔'' میں نے اپنے ساتھی کانسٹیبل سے کہا اور فرار کی کوشش میں مصروف شخص کے عقب میں زقند لگادی۔

میں اس سے کہیں زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس احمق نے دروازہ کھول کر وہاں سے نکلنے کے بجائے دیوار پھاندنے کا فیصلہ کیا۔ امجد کے بیان کے مطابق وہ تینوں نذیر حسین کے گھر کی دیوار پھلانگ کر ہی اندر آئے تھے۔ مذکورہ دیوار... بہ مشکل چار فٹ بلند رہی ہوگی۔ شاید اسی لیے اس نامعقول انسان نے اس ناٹی دیوار کو دروازے پر ترجیح دی تھی مگر میں بھلا کہاں چوکنے والا تھا۔ یہ ساری مارا ماری ہم نے اس لیے نہیں کی تھی کہ انہیں نکل بھاگنے کا موقع فراہم کرتے......!

اس بندے نے جیسے ہی دیوار کے اوپر ہاتھ جما کر اپنے بدن کو ایک جھٹکے سے اوپر اٹھایا، میں اس کے عقب میں پہنچ گیا۔ میں نے ریوالور کو نیفے میں اڑسا اور بھاگتے بھوت کی ٹانگوں میں ہاتھ ڈال کر ایک زوردار جھٹکے سے اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ اس عمل میں میرے دوسرے ہاتھ نے بھی بھرپور مدد کی تھی۔

ردعمل کے طور پر وہ دھڑام سے پشت کے بل صحن میں آگرا اور چاروں خانے چت ہوگیا۔ میں نے دوبارہ ریوالور نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ٹھڈوں سے اس کی مرمت شروع کردی۔ ان لمحات میں اس پر بے بھاؤ کی پڑ رہی تھی۔ وہ کم بخت مجھ سے بے دریغ پٹ رہا تھا اور مسلسل چلاتا چلا جارہا تھا۔ جب میں جی بھر کر اس کی درگت بنا چکا تو میں نے اپنا پاؤں روک لیا اور غصیلے لہجے میں کہا۔

''چلو...... اٹھ کر کھڑے ہوجاؤ......''

اس نے بے چون وچرا میرے حکم کی تعمیل کردی۔

اس دوران میں کانسٹیبل امجد نے اس کے دونوں گھائل ساتھیوں کو ہتھکڑیاں لگادی تھیں۔ امجد کی چلائی ہوئی گولیوں نے ان دونوں کے پاؤں اور پنڈلیوں کو بری طرح گھائل کردیا تھا۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہ رہے تھے۔

''تم نے کیا سمجھا تھا، مجھے غچا دے کر بھاگ نکلو گے۔'' میں نے اس کے گال پر ایک زناٹے دار طمانچہ رسید کرنے کے بعد پوچھا۔ ''کیا نام ہے تمہارا......؟''

''اچھو......'' اس نے لجاجت بھرے انداز میں جواب دیا۔ ''مجھے معاف کردیں تھانے دار صاحب۔ ہم لوگ تو چھوٹے چودھری صاحب کے حکم پر یہاں آئے تھے......''

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا پھر پوچھا۔ ''تمہارے ساتھیوں کے کیا نام ہیں؟''

''وہ گوگا اور حنیفو ہیں جی......'' وہ منمنایا۔

''چلو، تم بھی ان کے پاس......'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

وہ گردن جھکا کر میرے آگے چل پڑا۔

آئندہ دس منٹ میں ہم نے ان تینوں کو الٹی ہتھکڑیاں لگا کر بے بال و پر کر دیا پھر ایک آہنی زنجیر کی مدد سے میں نے ان کی ہتھکڑیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک بھی کر دیا تاکہ وہ تینوں جہاں بھی جائیں، ایک ساتھ جائیں۔ یہ سارے انتظامات ہم نے پہلے سے کر رکھے تھے۔ جب میں امجد کے ساتھ تھانے سے نکلا تھا تو میں نے تین چار ہتھکڑیاں، نائیلون کی مضبوط ڈوری، ٹارچ اور اسی نوعیت کا دوسرا سامانِ ضرور یہ ایک تھیلے میں ڈال کر تانگے میں رکھ لیا تھا۔

اس کے بعد میں نے نذیر حسین اور اس کی بیوی و بیٹی کو کمرے سے باہر نکال لیا اور تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

''تم لوگوں کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تینوں حملہ آور ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا ہے اور اب انہیں اپنے ساتھ تھانے لے کر جا رہا ہوں۔ میرا یہ ساتھی......'' میں نے کانسٹیبل امجد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''رات بھر اپنی رائفل سمیت ادھر تمہارے گھر میں موجود رہے گا تاکہ تم لوگ سکون سے سو سکو۔''

اس موقع پر نذیر حسین نے مجھ سے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! کیا ان ڈاکوؤں میں ماجھا بھی شامل ہے؟''

نوازش عرف گوگا، حنیف عرف حنیفو اور اشرف عرف اچھو کو میں نے بے دست و پا کر کے گھر کے صحن میں اکڑوں بٹھا رکھا تھا اور وہاں پر اتنا اندھیرا تھا کہ نذیر حسین کمرے کے اندر رہتے ہوئے ان تینوں کو شکل سے پہچان نہیں سکتا تھا۔ میں نے آج ماجھا کی ذات کے حوالے سے نذیر حسین سے جو غلط بیانی کی تھی، اسے صبح تک نبھانا ضروری تھا لہٰذا میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''یہ تینوں ماجھا کے قریبی ساتھی ہیں۔ ماجھا نے انہیں تاجی کو اٹھانے کے لیے بھیجا تھا۔ ماجھا خود اس وقت جنگل کے اندرونی حصے میں چھپا ہوا ہے۔ میں نے ان تینوں سے ماجھا کے بارے میں سب کچھ جان لیا ہے۔ میں انہیں تھانے کی حوالات میں بند کر کے خود جنگل کا رخ کروں گا۔ کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے میں انشاء اللہ ماجھا کو بھی گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

میری تشفی سے لبریز وضاحت کو سن کر نذیر حسین کی جان میں جان آئی۔ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے اس نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

''تھانے دار صاحب! آپ کو دینے کے لیے میرے پاس دعا کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ آج آپ نے جس طرح میری عزت کی حفاظت کی ہے، سوہنا رب اسی طرح ہمیشہ آپ کی عزت کی نگہبانی کرے......!''

''آمین!'' میں نے تہِ دل سے کہا۔

دولت مند انسان کو اپنی جان کی حفاظت سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اور غریب انسان کو اپنی عزت...... اگر دیانت داری سے غور کیا جائے تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس چیز کو کمانے میں انسان کو زیادہ محنت کرنا پڑے، وہ اس کے لیے عزیز ٹھہرتی ہے......!

ہمارے اس ''مڈ نائٹ وینچر'' میں چونکہ گولیاں بھی چلی تھیں لہٰذا نذیر حسین کے آس پڑوس والے جائے وقوعہ کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ قبل اس کے کہ اس ہنگامہ خیزی کی خبر چودھری فیروز کی حویلی تک پہنچتی، میں ان تینوں گرفتار شدگان کو تانگے میں ڈال کر تھانے کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

گوگا، حنیفو اور اچھو کی زبان کھلوانے کے لیے مجھے ''تھانے دارانہ'' محنت نہیں کرنا پڑی۔ نذیر حسین کے گھر میں، میں نے انہیں جو زک پہنچائی تھی اس نے ان کے دل و دماغ پر میری دہشت طاری کر دی تھی پھر تھانے کے اندر قدم رکھتے ہی وہ اور زیادہ خوفزدہ ہو گئے تھے۔ اس پر مستزاد میرے انسانی ہمدردی سے بھرپور رویے نے بھی انہیں آمادۂ تعاون ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ نذیر حسین کے گھر میں کانسٹیبل امجد کی فائرنگ سے گوگا اور حنیفو اچھے خاصے زخمی ہو گئے تھے اور میرے طوفانی ٹھڈوں نے اچھو کے چہرے کی کھال کو بھی کئی ایک مقامات سے ادھیڑ ڈالا تھا۔ میں نے تھانے پہنچ کر ان سے پوچھ گچھ کرنے سے پہلے گوگا اور حنیفو کی باقاعدہ مرہم پٹی کروائی تھی اور اچھو کو بھی مناسب طبی امداد دی گئی تھی۔ اس کے بعد ہی میں نے ان کے بیانات قلمبند کرنا شروع کیے تھے۔

ابتدا میں وہ تینوں چودھری انعام کے حوالے سے میرے بیان کے سلسلے میں ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے اور اسی تذبذب نے انہیں مجھ سے استفسار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''آج تک چودھری صاحب نے ہم سے ایسا دھوکا نہیں کیا۔'' اچھو نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''ہم تینوں ان کے خاص آدمی ہیں۔ اس سے پہلے بھی ہم ان کے لیے کئی کام کر چکے ہیں......؟''

اچھو کے آخری جملے نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اپنے اندرونی جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے معتدل انداز میں پوچھا۔ ''ماجھا کے جیل چلے جانے کے بعد اس کے گھر پر جن ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا، وہ تم ہی لوگ تھے نا......؟''

ان تینوں نے سراسیمہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر خاموشی سے گردنیں جھکالیں۔ میرا خون کھول کر رہ گیا......!

ان کی ندامت بھری خاموشی میں میرے سوال کا جواب چھپا ہوا تھا مگر اس سانحے کی تلافی اس اظہارِ ندامت اور جھکی ہوئی گردنوں سے ممکن نہیں تھی کیونکہ اس رات ایک نابینا عورت کے سینے میں برچھی گھونپ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور ایک معصوم لڑکی نے چھت سے کود کر اپنی جان دے دی تھی اور یہ گھناؤنا عمل انہی تینوں نے چودھری انعام کے حکم پر کیا تھا۔

چودھری انعام کے گرد میرا گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا جارہا تھا۔ نذیر حسین کے گھر سے تین ایسے جرائم پیشہ افراد میرے ہتھے چڑھے تھے جن کے بیانات چودھری انعام کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہونے والے تھے۔ میں نے ان کے بیانات قلمبند کرتے ہوئے ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہوا تھا۔

''چودھری انعام تم لوگوں کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا۔'' میں نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر سنجیدگی سے کہا۔ ''جب تک اس نے خود کو محفوظ سمجھا، وہ تم لوگوں کو شہ دیتا رہا اور تم سے اپنے سارے قانونی اور غیر قانونی کام کرواتا رہا۔ اب جبکہ میں نے اس کے گرد قانون کا شکنجہ کس دیا ہے تو اس نے تم تینوں کو قربان کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ تم ساری زندگی ایک ایسے خودغرض انسان کے لیے اپنی جان کو جوکھم میں ڈالتے رہے ہو جو اپنی جان کو بچانے کے لیے آج تم لوگوں کو پھنسانے پر تیار ہوگیا ہے۔ اگر تم لوگ چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ زیادہ سے زیادہ رعایت کروں تو چودھری انعام کے خلاف جو بھی بول سکتے ہو، وہ اپنے بیان میں لکھوا دو مگر صد فیصد سچ۔ میں جھوٹ بولنے والوں کو سخت ناپسند کرتا ہوں......''

وہ یک زبان ہوکر بولے۔ ''تھانے دار صاحب! ہم آپ کو جو بھی بتائیں گے، سولہ آنے سچ بتائیں گے۔''

''اور یہ بھی ذہن میں رکھنا کہ تم جو کچھ اپنے بیانات میں لکھواؤ گے۔ وہی سب عدالت میں جج کے سامنے بھی کہنا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے تاکیدی لہجے میں کہا۔

''جی بالکل...... ایسا ہی ہوگا!'' وہ پورے یقین سے بولے۔

اس کے بعد ان کی زبانیں اور میرا قلم اپنے اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد میں نے وہ بیانات انہیں پڑھ کر سنائے پھر ان کے انگوٹھے لگوا کر کام پکا کردیا۔

☆☆☆

حوالدار خادم حسین کی واپسی علی الصباح ہوئی۔ وہ کانسٹیبل مختار احمد کو حویلی میں چھوڑ کر اپنے ساتھ بہت ساری سنسنی خیز خبریں لے کر آیا تھا۔ میں اس رات اپنے کوارٹر پر نہیں گیا تھا۔ خادم حسین سیدھا میرے کمرے میں چلا آیا اور مضمحل انداز میں بولا۔

''ملک صاحب! میں نے اپنے حصے کا کام خوش اسلوبی سے نمٹادیا ہے۔ آپ کے مشن کا کیا رہا......؟''

''چودھری انعام کے بھیجے ہوئے تینوں بندے حوالات میں بند ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ماضی میں ماجھا کے گھر پر حملہ کرکے اس کی نابینا ماں صفیہ بی بی کی جان لے لی تھی اور ماجھا کی بہن شاداں کو چھت سے کودنے پر مجبور کردیا تھا۔ میں نے ان کے بیاناتِ حلفی سپردِ قلم کرلیے ہیں۔ وہ عدالت میں چودھری انعام کے خلاف بولنے کے لیے تیار ہیں۔''

''زبردست!'' خادم حسین نے تعریفی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''ملک صاحب! آپ نے چودھری انعام کو جیل کی دیواروں کے پیچھے سڑانے کا بڑا شافی انتظام کردیا ہے۔''

''اور تم نے کیا تیر مارا ہے......؟'' میں نے حوالدار کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''کچھ اپنی بھی تو سناؤ......!''

''آپ کا حکم تھا کہ ماجھا کو زندہ یا مُردہ گرفتار کرنا ہے۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن افسوس کہ میں اسے زندہ گرفتار نہیں کرسکا۔ ویسے ایک بات ہے کہ ماجھا بہت ہی احمق انسان ہے۔ دو دن پہلے وہ حویلی میں گھس کر چودھری فیروز کی ایسی کم تیسی کرگیا تھا۔ اگر اس میں ذرا سا بھی ورک ہوتا تو اسے اتنی جلدی دوبارہ اس حویلی کا رخ نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''خادم حسین! تم نے کیا بجھارتیں ڈالنا شروع کردی ہیں۔'' میں نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے تیکھے لہجے

میں کہا۔ ''جو بھی کہنا ہے، کھل کر کہو......''

''ملک صاحب! ادھر ظفر گڑھ کی حویلی میں دو لاشیں پڑی ہیں۔'' اس نے گمبھیر انداز میں بتایا۔ ''موقع کی کارروائی کے لیے آپ کو فوراً ادھر روانہ ہو جانا چاہیے۔ ہماری باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں......''

''دو لاشیں......!'' میں نے چونک کر حوالدار کی طرف دیکھا اور سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے، ماجھا اور اس کے کسی ڈاکو ساتھی کی لاشیں......؟''

''نہیں ملک صاحب......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ماجھا کا ساتھی ڈاکو تو بڑا ہی موقع پرست اور تھڑدلا ثابت ہوا۔ وہ ماجھا کو مشکل میں گھرا چھوڑ کر بھاگ نکلا اور ماجھا اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔ چوبی مڈی، بُغدا اور پٹواری کا ہاتھ......ادھر ہی پڑا ہے۔''

''پھر......'' میں نے اضطراری لہجے میں حوالدار سے دریافت کیا۔ ''خادم حسین! حویلی میں......دوسری لاش...... کس کی ہے......؟''

''چودھری فیروز کی......!'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''چودھری فیروز دوطرفہ فائرنگ کی زد میں آ گیا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''ماجھا اپنے ساتھی ڈاکو کی معیت میں چودھری انعام کو نمونۂ عبرت بنانے کی غرض سے حویلی میں داخل ہوا تھا لیکن اس کی رائفل کی ایک گولی پر کاتبِ تقدیر نے چودھری فیروز کا نام لکھ رکھا تھا۔ ڈاکوؤں کو اس بات کی ہرگز توقع نہیں تھی کہ حویلی کے اندر سے ایسی منظم مزاحمت پیش کی جائے گی۔ ہماری جانب سے کی جانے والی جوابی کارروائی نے ماجھا اور اس کے ساتھی ڈاکو کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ نتیجتاً وہ دونوں بے دریغ فائر کرنے لگے۔ اپنے دفاع میں جواباً ہمیں بھی گولیاں چلانا پڑیں۔ ماجھا کی چلائی ہوئی ایک گولی چودھری فیروز کے دل میں پیوست ہو گئی اور میری گن سے نکلنے والی ایک گولی نے ماجھا کو ٹھنڈا کر دیا......''

خادم حسین اپنی بات مکمل کرنے کے بعد خاموش ہوا تو میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''ہمیں فوراً ظفر گڑھ پہنچنا ہو گا اور تم بھی میرے ساتھ جاؤ گے۔''

''ضرور جاؤں گا ملک صاحب!'' وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔ ''اور میرے ساتھ ایک جوڑی آہنی زیور بھی جائے گا۔''

میں نے غیر ارادی طور پر سوال کیا۔ ''وہ کس لیے خادم حسین؟''

''چودھری انعام کے لیے......'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''اسے گرفتار کرنے کا اس سے زیادہ موزوں موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں لگے گا۔ ابھی تک یہ بات اس کے علم میں نہیں ہے کہ آپ نے اس کے تین بندوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ اگر چھوٹے چودھری کو ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی کہ اس کے تینوں نمک خوار، عدالت میں اس کے خلاف بیان دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو وہ ہماری پہنچ سے کہیں دور نکل جائے گا۔''

حوالدار خادم حسین کی دلیل دم دار تھی لہٰذا میں نے اس سے کامل اتفاق کرتے ہوئے کرسی چھوڑ دی اور ہم ضروری تیاری میں مصروف ہو گئے۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد میں خادم حسین کے ساتھ تانگے پر سوار ہو کر موضع ظفر گڑھ روانہ ہو گیا۔

یہ بائیس جنوری کی ایک یخ بستہ صبح تھی۔ میں پچھلے چوبیس گھنٹے سے مسلسل مصروفِ کارِ سرکار تھا اور ادھر حویلی میں ابھی جس درجے کے معاملات کو نمٹانا تھا، ان میں آج کا سارا دن صرف ہو جانا تھا۔ پولیس کے بارے میں الٹی سیدھی منفی باتیں کرنے والے لوگوں کو کاش اس حقیقت کا احساس ہو جائے کہ ہمارا کام جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے......!

اس روز میں نے چودھری فیروز کی حویلی کے معاملات کو کس طرح ہینڈل کیا، میں اس کی تفصیل بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ مجھے قارئین سسپنس کی ذہانت، سمجھ داری اور مآل اندیشی پر کوئی شک نہیں ہے۔ ہاں، البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ حوالدار خادم حسین نے ماجھا کی حویلی میں دوبارہ آمد کو جو اس کی بے وقوفی اور حماقت پر منطبق کیا تھا، وہ میری نگاہ میں مشیت ایزدی تھی۔

وہ ثالث بالخیر، لیل و نہار کا خالق اور مالک ہے۔ اس قادر مطلق نے اِس دنیا اور اُس دنیا کی حرکات و سکنات کو پوری وضاحت کے ساتھ لوحِ محفوظ پر تحریر کر رکھا ہے۔ ظفر گڑھ کے وسنیک چودھریوں کے ظلم و جبر کے خلاف زبان کھولنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ انسان کے لبوں پر تو قفل ڈالے جا سکتے ہیں مگر دلوں کی دھڑکن کو اپنی مرضی کے موافق چلانا ممکن نہیں ہوتا۔ جانے کتنے ہاتھ چودھریوں کی زیادتیوں کے خلاف آسمان کی جانب اٹھتے ہوں گے اور کتنے دلوں کا خون، آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ جاتا ہو گا......!

انہی بے کس و لاچار ہاتھوں اور دلوں میں سے کسی کی میرے پروردگار نے سن لی تھی۔ اس کے ہاں دیر تو ہو سکتی ہے مگر اندھیر نہیں۔

(تحریر: حُسام بٹ)